الاقربا

اسلام آباد

الاقرباء فاؤنڈیشن، اسلام آباد

Syed Mansur Aquil
Chairman Board of Editors
Al-Aqreba Foundation
464, St. 58, I-8/3, ISLAMABAD
PAKISTAN

Paris, September 15th, 2004

Dear Syed Mansur,

Further to your ISSN request for your serial *Al-aqreba*. I am pleased to inform you that your serial has been recorded in the ISSN Register as follows:

ISSN 1812-8734
Key title: Al-aqriba

According to the ISO standard on ISSN, the ISSN number must be printed prominently on each issue of your publication, preceded by the letters ISSN, preferably in the upper right hand corner of the cover.

This ISSN is valid until the above title remains uncharged. If you intend to change it, please inform us (and send the appropriate photocopies) so that we may decide if a new ISSN assignment is needed.

Other changes such as the publisher's name, place of publication (town / country of publication), frequency ... do not affect the ISSN, but we wish to be kept informed (with the appropriate photocopies) so that we may update the bibliographic data in our records.

Do not hesitate to contact us or visit our web site (www.issn.org) for any further information.

Thanking you for your kind cooperation in this matter, I remain,

Yours sincerely,

Alain Roucolle (Mr.)

...TRE INTERNATIONAL D'ENREGISTREMENT DES PUBLICATIONS EN SERIE
...TERNATIONAL CENTRE FOR THE REGISTRATION OF SERIAL PUBLICATIONS
20, rue Bachaumont · 75002 Paris · France

Telephone : 01 44 88 22 20 · Telecopie : 01 40 26 32 43
Phone : +33 1 44 88 22 20 · Fax : +33 1 40 26 32 43
Web Site : http://www.issn.org · E-mail: issnic@issn.org

سہ ماہی الاقرباء اسلام آباد

(تہذیب و معاشرت، علم و ادب اور تعلیم و ثقافت کی اعلیٰ قدروں کا نقیب)

جلد نمبر ۷ شمارہ نمبر ۴ اکتوبر۔دسمبر ۲۰۰۴ء

الاقرباء فاؤنڈیشن۔اسلام آباد

مکان نمبر ۲۶۴ سٹریٹ نمبر ۵۸ آئی ۸/۳ اسلام آباد، فون ۴۴۴۲۶۸۶

E-mail: alaqrebaislamabad@hotmail.com

سہ ماہی الاقرباء اسلام آباد

شمارہ	اکتوبر۔دسمبر۲۰۰۴ء
ناشر	سید ناصر الدین
کمپوزنگ	نعیم کمپوزرز۔اسلام آباد
طابع	ضیاء پرنٹرز۔اسلام آباد

زرتعاون

فی شمارہ	۵۰روپے
سالانہ	۲۵۰روپے
بیرون ملک فی شمارہ	۶ڈالر/۴ پاؤنڈ
بیرون ملک سالانہ	۲۵ڈالر/۱۵ پاؤنڈ

مندرجات

کہانی، خاکہ، طنز و مزاح

حمد و نعت

مافیا

زیرِ نظر اداریہ کا عنوان (مافیا) اطالوی زبان کا لفظ ہے جو لغوی حیثیت بھی رکھتا ہے اور تہذیبی پس منظر کا بھی حامل ہے۔ آکسفورڈ ڈکشنری کے مطابق مافیا ''مجرموں کا بین الاقوامی گروہ اصلاً سسلی سے تعلق رکھنے والا' اب اٹلی اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں بھی موجود ۲-خفیہ طور پر اثر و رسوخ اور دباؤ سے کام لینے والا گروہ-لفظاً دونس دینے والا'' کم و بیش یہی مفہوم و معنی کئی دیگر لغات میں دیئے گئے ہیں۔ البتہ باعتبار ہجہ یہ لفظ 'Mafia' اور 'Maffia' دونوں طرح لکھا گیا ہے۔ گذشتہ چند دہائیوں میں اس لفظ نے اس انداز سے عالمگیریت کا مقام و مرتبہ حاصل کیا کہ دنیا کی متعدد زبانوں نے اس لفظ کو اپنالیا۔ چنانچہ اردو میں بھی یہ لفظ بعینہٖ منتقل ہوگیا اور اس کا استعمال زندگی کے مختلف شعبوں کے حوالے سے بکثرت ہونے لگا۔ اس استعمال کی وجوہ میں اصول و قانون اور اخلاقیات پر بے اصولی' لاقانونیت اور ذاتی مفادات کو فوقیت دینا سب سے واضح انداز میں سامنے آیا۔ یہ عمل اس برق رفتاری سے آگے بڑھا کہ اس عفریت سے زندگی کا کوئی شعبہ محفوظ نہ رہ سکا بالخصوص ادب اور سیاست و صحافت میں مافیا کی اثر پذیری نے حالات کو اور بھی دگرگوں کردیا۔ سیاست میں ایک مستقل بحران نے جنم لیا جو وطنِ عزیز کے رگ و پے میں پیوست ہو کر رہ گیا اور ایک طاقتور مافیا نے جمہوریت کے نام پر رائے عامہ کو یرغمال بنالیا جس کے منحوس اثرات زندگی کے ہر شعبہ میں مرتب ہوئے بلکہ ملک میں ہر سطح کی انتظامیہ کو بددیانتی اور نااہلیت کا زہر پلا کر مستقلاً مفلوج کردیا گیا اور ملکی دولت چند ہاتھوں میں مرتکز ہو کر رہ گئی۔

ادب و صحافت کا یہ اعزاز کہ اس نے آزادی کی تحریک کو اپنی جملہ توانائیوں کو بروئے کار لا کر پروان چڑھایا۔ حصولِ آزادی کے کچھ عرصہ بعد ہی سے دھندلانا شروع ہوگیا اور اب عالم یہ ہے کہ یہ دونوں شعبے بھی اجارہ داریوں کے زندانی بن کر رہ گئے ہیں۔ ''پرورشِ لوح و قلم'' کا عہد (Commitment) ہماری ادبی و شعری تاریخ کا نقطۂ عروج تھا جسے ایک عظیم انسان اور عظیم شاعر نے اس طرح نبھایا کہ حیدرآباد جیل سے ایک آواز بلند ہوئی:

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے		کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

لیکن فیض کے فکر و فن کی عظمت کو خراجِ تحسین پیش کرنے میں یہ معاشرہ کما حقہٗ اپنا فرض ادا نہیں کر سکا اور نئی نسل بہ استثنائے چند اقبال کے بعد افقِ ملی پر طلوع ہونے والے اس کوکبِ درخشاں سے اکتسابِ نور نہ کر سکی۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ بعض تملق پرست حاشیہ نشینوں نے ان کے انداز و اسلوب پر شب خون مارنے کی منافقانہ جسارت کی لیکن بقول کسے جو زندگی بھر کوشش کے باوجود سگریٹ سے خاک جھٹکنے کا فیض جیسا سلیقہ نہ اپنا سکے۔ وہ فیض کے فکر و فن کی نقالی کیا کرتے! ان پست قامتوں نے اپنا قد کاٹھ بڑھانے کے لئے سیاسی بیساکھیوں کا ضمیر فروشانہ استعمال کیا اور میڈیا کے استحصال کے ہنر میں خود کو طاق بنالیا۔ یہ جب کبھی خود پر گھیرا تنگ ہوتا دیکھتے تو وطن سے راہِ فرار اختیار کرتے اور دیارِ غیر میں سیاسی پناہیں مانگتے۔ یہی نہیں بلکہ خود کو باغیانہ شاعری کا نقیب بنا کر پیش کرتے بلکہ دشمن ملک کے سامعین و ناظرین سے وطن مخالف ہرزہ سرائیوں پر داد و تحسین حاصل کرتے حالانکہ افلاسِ فکر و فن کے مارے ہوئے یہ دریوزہ گر نام نہاد شاعر سطحی جذباتیت سے بڑھ کر نوجوان نسل کو کچھ نہ دے سکے۔ انہوں نے سیاست، صحافت اور ادب کا ایک مکروہ اور قبیح امتزاج پیدا کیا جس میں ایک موثر ترین مافیا کے تمام وصف مجتمع ہو گئے چنانچہ اس مافیا نے جب چاہا حبِ وطن کا روپ دھارا اور جب چاہا بغاوت کا علم بلند کیا اور ہر اُس آستان پر سرِ تسلیم خم کیا جہاں ان کے کاسۂ گدائی کو ذاتی مفادات کی بھیک میسر آسکتی تھی:

نیلام جو ناموسِ قلم کرتے رہیں گے		سر ہوں گے فراز ان کے جو خم کرتے رہیں گے

اہلِ قلم اور اہلِ ہنر ملک و ملت کا سرمایہ ہی نہیں بلکہ اعلیٰ انسانی اقدار کے ترجمان کی حیثیت سے تکریم و تحسین کے بھی مستحق ہوتے ہیں چنانچہ وطنِ عزیز میں حکومتی سطح پر ہر سال اعترافِ علم و فن کے طور پر "عطائے اعزازات" کا اہتمام کرنا یقیناً ایک مبارک روایت ہے جس کو ایک شفاف اور اعتماد آفریں نظامِ کار کے تحت جاری رہنا چاہئے۔ لیکن بدقسمتی سے عملاً ایسا ممکن نہیں ہو سکا اور ہر سال ۱۴ اگست کو جن ناموں کا اعلان کیا جاتا ہے اور جو ہستیاں ۲۳ مارچ کو صدرِ مملکت کے دستِ مبارک سے حصولِ اعزازات کا شرف حاصل کرتی ہیں ان میں بہت کم تعداد حقیقی استحقاق سے بہرہ مند نظر آتی ہے جبکہ ایک بھاری اکثریت "بندر بانٹ" سے مستفیض ہوتی ہے اور وہ کہ جو کہہ سکیں کہ "مصرعہ من قطرۂ خونِ من است" خال خال فہرستِ اعزاز میں جگہ پاتے ہیں اور ایسے بکثرت نظر آتے ہیں جن کا کہا ہوا ہر مصرعہ

"اُمّ الخبائث" کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ انہیں "اعزازِ مکرر" سے بھی سرفراز کیا جاتا ہے کہ وہ "مکرر ارشاد" کے شاعرانہ تفاخر کے متمنی رہتے ہیں۔

ادبی مافیا کے یہ لوگ علمی، ادبی اور شعری "عظمت" کے پُرفریب خول زیبِ تن کیے اعلیٰ سرکاری مناصب پر بھی قابض نظر آتے ہیں۔ ویسے تو ان کے اس وسیلۂ روزگار پر کسی کو معترض نہیں ہونا چاہئے کہ ہمارے معاشرے میں اہلیت ولیاقت سے محروم لوگ خاص طور پر سرکاری وسائل معاش کے لئے اہل گردانے جاتے ہیں کہ ملازمتوں کے عقبی دروازے یا رشوت وسفارش کی بیساکھیاں انہیں ہمیشہ میسر رہتی ہیں تاہم یہ سب کچھ ایک غیر شفاف طریق انتخاب کا شاخسانہ ہے حالانکہ ملکی آئین کے تحت جب پبلک سروس کمیشن جیسے ادارے موجود ہوں تو یہ بات ہرگز قرینِ انصاف نہیں کہ دیگر اہل شہریوں کو عام مقابلہ کے معروف ومروّج مواقع سے محروم کر دیا جائے اور دباؤ یا سفارش کی بنیاد پر پسندیدہ لوگوں کو ایسے قومی سطح کے اداروں کا سربراہ بنا دیا جائے جنہیں وہ ذاتی مقاصد کی ترویج کے لئے استعمال کریں جبکہ یہ عین ممکن ہوسکتا ہے کہ ان سے کہیں بہتر اور باصلاحیت لوگ دستیاب ہوں۔ ماضیٔ قریب کے تناظر میں ایسی علمی وادبی قدآور شخصیات کی مثالیں موجود ہیں جنہوں نے دل ودماغ کی اعلیٰ صلاحیتوں کے باوجود کبھی پسند نہیں کیا کہ وہ کسی ایسے رتبہ پر فائز ہوں جس پر دوسروں کو مقابلے کا موقع نہ دیا گیا ہو۔ اس ضمن میں ممتاز حسن، شیخ محمد اکرام، قدرت اللہ شہاب اور مختار مسعود جیسی ذہین وزیرک اور صاحبانِ علم و حکمت شخصیات کا حوالہ دیا جاسکتا ہے تو پھر کیوں اس دور میں ایک صریح ظلم وناانصافی کا مسلسل ارتکاب کیا جارہا ہے اور وہ بھی پوری دیدہ دلیری کے ساتھ؟

قمر رُعینی ☆

فن تاریخ گوئی۔ایک تحقیقی مطالعہ

کسی بھی واقعہ کو ولادت یا وفات کے سن کو، یا کسی کتاب شائع ہونے کے سال کو ماہرین اعداد جمل اگر کسی ایسے لفظ، جملہ یا مصرع میں محفوظ کرلیں کہ جب ان کے مقررہ اعداد کو جمع کیا جائے تو مطلوبہ سن برآمد ہو تو اسے تاریخ گوئی کا فن کہا جاتا ہے۔اس قسم کے جملے یا مصرعے تاریخی کہلاتے ہیں بسا اوقات ان کے پس منظر میں بہت بڑی تفصیل یا واقعہ ہوتا ہے گویا فن شاعری میں تاریخ گوئی کو روزمرہ واقعات اور تاریخ عالم کا خلاصہ کہا جاسکتا ہے۔اہم واقعات وحوادث کو یاد رکھنا اور بوقت ضرورت اس کا حوالہ دینا ایک انسانی فطرت بھی ہے اور ضرورت بھی جیسے جیسے انسانی معاشرہ ترقی کرتا گیا' اس بات کی اہمیت بڑھتی گئی اور ایام و ماہ و سال کا تقرر عمل میں آیا چنانچہ مختلف قسم کے قدیم ترین سنین اس دعوے کا ثبوت ہیں۔اہم ترین شخصیات کے سنین ولادت و وفات بھی اسی کی ذیل میں آتے ہیں پھر جب شعروادب پر پانچویں چھٹی صدی ہجری کا سورج طلوع ہوا تو نوابغ نے بعض واقعات و مسائل کی طرف الفاظ میں ماہ و سال کے اشارے دیئے جیسے فردوسی نے شاہنامہ کے بارے میں کہا کہ:

زہجرت شدہ پنج ہشتاد بار　　　　که گفتم من ایں نامہ شہریار

پھر یہ فن آہستہ آہستہ ترقی کرتا گیا یہاں تک کہ آج بھی فن شاعری میں یہ ایک اہم ترین اور عالمانہ صنف کی حیثیت سے روشناس ہے اس فن میں صاحبان علم ونظر نے اپنے کمالات کے جوہر دکھائے۔غیاث اللغات (ص۸۹) میں تاریخ گوئی کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

''تاریخ' وقت چیزی پدید کردن (از منتخب) و در اصطلاح تعین کردن مدتی را از ابتدائی امر عظیم وقدیم مشہور تا ظہور امر ثانی کہ عقب اوست تا کہ دریافت شود ہر زمانہ آیندہ و دیگر مدت ظہور این امر ثانی بہ لحاظ نسبت بعد مدت امر قدیم مشہور اول''

☆　فاضل مضمون نگار خود ایک کہنہ مشق تاریخ گو ہیں چنانچہ آپ نے زیر نظر مضمون اور مضمون نگار کو جن الفاظ سے متعارف کرایا ہے اور جن سے سن تاریخ ہجری برآمد ہوتا ہے وہ علی الترتیب یہ ہیں: ''معاون تاریخ گوئی'' اور راقم الحروف جلیلہ قمر رُعینی

۱۴۲۳ھ　　　　۱۴۲۳ھ

(اگرچہ عربی قاعدے کے مطابق ''راقم الحروف الجلیلہ'' ہونا چاہیے لیکن اس طرح اعداد میں فرق پڑ جاتا ہے۔ادارہ)

حروف ابجد اور ان کے اعداد: فن تاریخ گوئی کے موجدین و ماہرین نے عربی حروف پر مشتمل آٹھ مرکبات ترتیب دیے ہیں جو یہ ہیں۔

ابجد ہوز حطی کلمن سعفص قرشت ثخذ ضظغ

اور ان حروف کے اعداد اس طرح مقرر کیے ہیں۔

ا	ب	ج	د	ہ	و	ز	ح	ط	ی	ک	ل	م	ن
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰	۲۰	۳۰	۴۰	۵۰
س	ع	ف	ص	ق	ر	ش	ت	ث	خ	ذ	ض	ظ	غ
۶۰	۷۰	۸۰	۹۰	۱۰۰	۲۰۰	۳۰۰	۴۰۰	۵۰۰	۶۰۰	۷۰۰	۸۰۰	۹۰۰	۱۰۰۰

ابجدی الفاظ کے معنی ملاحظہ فرمایئے: (تیساں اکبر آبادی کی کتاب "ذرج تاریخ" اور دیگر ذرائع سے ان معانی کا اظہار ہوتا ہے لیکن ان کا مستند ہونا تا حال مطلوب ہے۔)

لفظ	معنی	لفظ	معنی	لفظ	معنی	لفظ	معنی
ابجد	شروع کیا	ہوز	متصل ہوا	حطی	جان گیا	کلمن	سخن گو ہو گیا
سعفص	اس سے سیکھا	قرشت	ترتیب دیا گیا	ثخذ	حفاظت کی	ضظغ	تمام کیا

فن تاریخ گوئی کا آغاز: یہ بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی کہ حروف کے اعداد کس نے مقرر کئے اور کس سن میں اور یہ کہ کیا ان الفاظ کا کوئی مفہوم بھی ہے؟ البتہ اس امید میں قیاس و گمان کے گھوڑے دوڑائے جا سکتے ہیں۔ ابجدی تاریخ کے لئے جن حروف کے مجموعے تیار کیے گئے وہ سارے کے سارے عربی ہیں لیکن پوری عربی شاعری میں جاہلی شاعری سے لے کر بعثت کے بعد بلکہ چھٹی ساتویں صدی تک میرے علم کے مطابق تا حال ابجدی تاریخ کا سراغ نہیں ملتا۔

عربی زبان میں کئی دوسری زبانوں مثلاً لاطینی عبرانی وغیرہ کے الفاظ بھی ملتے ہیں قیاس کیا جا سکتا ہے کہ جس طرح لاطینی حروف کے مجموعے (الفابیٹا وغیرہ) مقرر کئے گئے ہیں ممکن ہے کہ اس کے زیر اثر عربوں نے یا عربی جاننے والے ایرانیوں نے یا کسی بھی عربی بولنے والے غیر عربی ملک کے شاعروں نے ابجدی حروف کے موجودہ مجموعے ترتیب دیے ہوں لیکن یہ سوال پھر بھی تشنہ رہ جاتا ہے کہ ابجدی مجموعوں کے لئے ان کے اعداد مقرر کرنے کی کس نے ضرورت محسوس کی۔

عرب اور فن تاریخ: عربوں کے یہاں یہ رواج تھا کہ کسی کی پیدائش یا وفات یا کسی بات یا عام واقعہ کو کسی بہت اہم واقعہ کی مناسبت سے یاد رکھتے اور ولادت رسول مقبولؐ تک عربوں کا اپنا سن نہیں تھا چنانچہ حضورؐ کی تاریخ ولادت کو ابرہہ کے مشہور واقعہ فیل کی مناسبت سے بیان کیا گیا۔ جبکہ اسی دور میں ایران۔ یونان اور ہندوستان میں مختلف سنین جاری تھے خود عربوں کے یہاں بھی عیسوی سن سے شناسائی تھی۔ پھر سیدنا عمر ابن خطابؓ نے صحابہ کرام کے مشورے سے سن ہجری رائج کیا جو آج سعودی عرب اور بعض عرب ممالک میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے ان کے علاوہ بعض دوسرے ممالک میں جہاں مسلمان آباد ہیں وہاں پڑھے لکھے طبقے میں اور خصوصاً رمضان، عیدین اور دوسرے تہواروں کیلئے تکلفاً سنِ ہجری کو یاد رکھا جاتا ہے جبکہ سن عیسوی عام ہے۔

حروف کے اعداد مقرر ہو جانے کے بعد جہاں شعراء نے اس سے ذہنی مسرت و شادمانی اور اظہار علمیت کا کام لیا وہاں دوسرے طبقے نے شاعرانہ صفات سے ہٹ کر اسے اور مقاصد کیلئے بھی استعمال کیا۔ صاحب اعجاز التواریخ کے مطابق علم نجوم میں ان عددی حروف کا استعمال ہوتا رہا ہے۔ جنتریوں میں دیکھا گیا ہے کہ علم جفر، علم الاعداد وغیرہ جس میں نمبروں کے کھیل کے ذریعے لوگ سادہ لوح عوام کی جیبوں سے کھیلتے ہیں۔ بعض تعویذوں میں اعداد کا استعمال ہوتا ہے چوکھٹے بنا کر مختلف اعداد لکھ دیئے جاتے ہیں اور اس میں کسی انسان کی تقدیر کا حال ہوتا ہے اس کو مستقبل میں پیش آنے والے حالات سے بچاؤ یا کسی بہتری کی صورت کی نوید ہوتی ہے اور تو اور یار لوگوں نے اللہ رسول اور قرآن کریم کی سورتوں کے علاوہ پورے قرآن کو اعداد کے طلسم میں بند کر دیا ہے گویا پورا قرآن پڑھنے کی ضرورت نہیں نہ طیب و طاہر ہونے کی شرط ہے بس آپ ایک لمحے میں پورا قرآن شریف یوں ختم کر سکتے ہیں کہ پورے قرآن کے اعداد دوہرا دیجئے بس قرآن ختم' رہ گئی بسم اللہ تو اس کے بھی عدد موجود ہیں یعنی ۷۸۶ جبکہ یہ اعداد غلط ہیں پوری بسم اللہ کے صحیح اعداد ۷۸۷ ہوتے ہیں اور اللہ کو یاد کرنا ہو تو ۶۶ کہہ لیجئے۔ خاتم المرسلینؐ کا اسم گرامی لینا ہو تو ۹۲ کہہ دیجئے یا محمدؐ کہنا ہو تو ۱۰۳ کہہ دیجئے۔ گویا علم الاعداد نے بہت سے کام آسان کر دیئے۔

ایک گمان یہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ ان اسلام دشمن گروہ نے مسائل و معاملات اور اپنی معلومات کو محفوظ رکھنے کیلئے ان الفاظ کے اعداد مقرر کر لئے ہوں اور اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کیلئے Code کے طور پر ان کے اعداد سے کام لیتے رہے ہوں۔ پھر یہ راز افشا ہونے پر شعراء نے اُچک لیا ہو۔ پہلے خود میرا قیاس یہ تھا کہ شاید باطنی فرقے نے ابجد کے اعداد مقرر کئے ہوں لیکن اس خیال کی نفی خود بخود تاریخی طور پر ہو جاتی ہے اس

لئے کہ ہلاکو خان کے ہاتھوں جب بغداد پر تباہی آئی تو ان دنوں شیخ سعدی " کا طوطی بول رہا تھا یعنی یہ چھٹی ساتویں صدی ہجری کی بات ہے، جب اس تباہی پر سعدی نے زوال بغداد کا مشہور مرثیہ تصنیف کیا تھا یعنی:

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں　　بر زوال ملک مستعصم امیر المومنیں

اور یہ وہ دور ہے جب پوری تاریخ کے علاوہ یعنی الفاظ میں بیان کرنے کے علاوہ اعداد کا رواج ہو چکا تھا۔ چنانچہ پانچویں اور چھٹی صدی ہجری میں ابجدی تاریخ کے نمونے دستیاب ہیں۔ پھر یہ سوال اپنی جگہ تشنہ تحقیق ہے کہ (۱) حروف ابجد کے مجموعے کس نے مرتب کیے (۲) کیوں کیے (۳) کس سن میں کیے۔ یعنی یہ ایک منطقی مسئلہ ہے جو امور ثلاثہ کے گرد گھوم رہا ہے، اور اس ایجاد کو ہم تثلیث پرستوں سے بھی منسوب نہیں کر سکتے کیوں کہ ان کے یہاں تاریخ گوئی کے نمونے، جو مجھے دستیاب ہوئے وہ سولہویں صدی عیسوی کے ہیں جبکہ فارسی زبان اور اردو زبان میں اس سے تقریباً دو یا تین صدی قبل اس کا چلن عام ہو چکا تھا۔

ایک نیا قاعدہ (اجتث): یہ قاعدہ اجتث کہلاتا ہے۔ ۱۹۵۰ء کی بات ہے کہ ان دنوں ایک مشہور عروضی بزرگ اور استاد شاعر حضرت علامہ اطہر ہاپوڑی راولپنڈی میں قیام فرما تھے۔ ان کے پاس یہاں کے کئی جید حضرات کو میں نے مؤدب ہو کر اکتساب فن کرتے دیکھا ہے استاذی نوح ناروی کی وجہ سے میرا تعارف ہوا تھا۔ اطہر صاحب مجھے اپنے چھوٹوں کی طرح سمجھتے تھے چنانچہ انہوں نے مجھے بتایا کہ قاعدہ ابجد کے علاوہ ایک اور قاعدہ بھی ہے جسے قاعدہ "اجتث" کہا جاتا ہے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ اردو میں عربی کے مروجہ تمام حروف ترتیب سے لکھ کر الف سے ذال تک اکائی کے عدد لکھے جاتے ہیں اس طرح:

ا	ب	ت	ث	ج	ح	خ	د	ذ
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹

پھر رے سے عین تک دہائیاں شمار کریں

ر	ز	س	ش	ص	ض	ط	ظ	ع
۱۰	۲۰	۳۰	۴۰	۵۰	۶۰	۷۰	۸۰	۹۰

اور اب غین سے ی تک ۱۰۰ سے شروع کریں اور ہر حرف پر ۱۰۰ بڑھاتے جائیں۔

غ	ف	ق	ک	ل	م	ن	و	ہ	ی
۱۰۰	۲۰۰	۳۰۰	۴۰۰	۵۰۰	۶۰۰	۷۰۰	۸۰۰	۹۰۰	۱۰۰۰

اب آپ خود ہی قاعدہ ابجد اور اجتث کے مابین مقررہ اعداد کا فرق دیکھ لیجئے۔ لیکن افسوس کہ میں

حضرت اطہر ہاپوڑی سے قاعدہ اجث کا کوئی نمونہ حاصل نہیں کر سکا۔

انگریزی ادب میں تاریخ گوئی: یہاں میں اپنے قارئین کو ایک حیرت انگیز بات یہ بھی بتاتا چلوں کہ جس طرح اردو فارسی میں فن تاریخ گوئی کا رواج ہے اسی طرح انگریزی میں بھی ہے لیکن ان کے یہاں پوری الفبائی تختی کو استعمال نہیں کیا گیا بلکہ صرف سات حروف سے ہی کام چلایا گیا ہے یعنی ان کے ہاں یہ ترتیب:

ایم	ڈی	سی	ایل	ایکس	وی	آئی
۱۰۰۰	۵۰۰	۱۰۰	۵۰	۱۰	۵	۱

گویا ان لوگوں نے ہفتے کے سات دن کی رعایت سے صرف سات حروف سے اپنا سارا مسئلہ حل کر لیا ہے اور اس میں انھوں نے مناعیاں بھی کی ہیں۔ مثال کے طور پر جس طرح تاریخ کی ایک بڑی مشہور تاریخ ہے۔

از جائے حکیم ہشت برگیر سہ مرتبہ نصف نصف کم کن

یعنی حکیم کی ح کے عدد ۸ لے لیجیے۔ اب اس کو تین مرتبہ مسلسل نصف پھر نصف پھر نصف کر لیجیے اس طرح ۸۔۔۴۔۔۲۔۔۱

یعنی ۱۲۲۸ھ اسی طرح ایک انگریز شاعر نے بھی حافظ کی تاریخ وفات نکالی ہے اور لفظ ''مصلہ'' کے حروف کو انگریزی میں اپنے طور پر برتا ہے انگریزی شاعر لکھتا ہے۔

Thrice Take Thou From Musallah's Earth
M + L + L
1000 500 500 =1100
It's Richest Grain
1 + 1 + 100 + 1 = 103 x 3 = 309

اب ۱۱۰۰ سے ۳۰۹ کو منہا کر دیجیے تو ۷۹۱ یعنی خاک مصلی کے برابر تاریخ نکل آئے گی۔

اسی طرح ملکہ الزبتھ کے مرنے کی تاریخ

My Day is closed in immortality MDC111=1603

مارٹن لوتھر کے مرنے کی تاریخ لاطینی زبان اور انگریزی حروف میں اسی مقررہ قاعدے کے مطابق ایک شاعر نے اس طرح نکالی (یہاں ڈاکٹر براؤن نے لاطینی فقرے کا انگریزی ترجمہ نہیں دیا اور نہ براؤن کا فارسی میں ترجمہ کرنے والوں نے فارسی میں۔ اس لیے محض الفاظ اور مادۂ تاریخ لکھنے پر اکتفا کر رہا ہوں۔)

Ecce Nvnc Moritvr ivstvsin Pace Christi Exitvetbeatvs

(براؤن کا ترجمہ ادبیات ایران صفحہ ۱۰۸۔۱۰۷)

اب دیکھئے M ایک بار ------- 1000

C پانچ بار 5x100= 500

V چھ بار 6x5 = 30

I چھ بار 6x1 = 6

X ایک بار 1x10 = .10 1546ء

تاریخ گوئی کے کچھ بنیادی اصول: اردو زبان میں عربی حروف ہجا کے علاوہ فارسی کے حروف، گ اور ژ اور ہندی کے حروف پ---ٹ---چ---ڈ---ڑ---بھی شامل ہیں اور ان تمام حروف کا شماران کے سابقہ حرف کے عدد کے مطابق ہوگا یعنی ژ---ز کے برابر ڈ---د کے برابر چ۔ج کے برابر ڑ کے بھی ر کے برابر عدد لئے جائیں گے۔

اہم نقاط: الف دو طرح کا ہوتا ہے ایک مقصورہ کہلاتا ہے دوسرا الف ممدودہ کہلاتا ہے یعنی جس الف پر مدّ ہوتا ہے اور عام طور پر اس طرح (آ) لکھا جاتا ہے۔ لالہ ٹیک چند بہار نے بہارِ عجم میں اور مرزا قتیل نے برہان قاطع میں اس کو (اا) لکھا ہے مگر قاعدہ جمل یعنی فن تاریخ میں اس کا ایک ہی عدد شمار ہوگا۔ اگر بزرگوں میں سے کسی نے یا موجودہ کسی شاعر نے کسی مجبوری کے تحت یا غلط فہمی کی بنا پر دو عدد شمار کئے ہیں تو وہ اصولی طور پر غلط ہے۔ فن تاریخ گوئی میں مکتوبی حروف شمار ہوتے ہیں اور مد کوئی حرف نہیں بلکہ حرکت ہے۔ بقول علامہ شفق عماد پوری مد حساب کی مد سے خارج ہے۔

ہمزہ: یہ بھی کوئی مستقل حرف نہیں ہے بلکہ بعض مقامات پر اشباع حرکت کے لئے استعمال ہوتا ہے اور بعض جگہ یائے مجہول یا یائے معروف میں ایک یے کا قائم مقام ہوتا ہے تو جہاں یے کا قائم مقام ہوگا اس کو ہمزہ نہیں بلکہ یے سمجھا جائے گا اور اس کے دس عدد لئے جائیں گے مثلاً آگئے بروزن فاعلن میں دو یے شمار کر کے بیس عدد لئے جائیں گے اسی طرح اگر کسی جگہ بغیر جھٹکے کے ادا ہو مثلاً آئے (بروزن فاع) تو یہاں بھی ہمزہ کوئی حرف شمار نہ ہوگا صرف ایک ی کے دس عدد لئے جائیں گے۔ استاد داغ کہتے ہیں:

ہم کس شمار میں رہے ہو کر خمیدہ پشت یہ حرف ہمزہ وہ ہے کہ جس کا عدد نہیں

اسی طرح لفظ آئنہ بروزن فاعلن اور آئینہ بروزن مفعولن دونوں میں فرق ہے پہلے آئنے میں ہمزہ نہ یا کا قائم مقام ہے اور نہ اس کی کوئی اصل حیثیت ہے محض اشباع حرکت کے لئے ہے اس لئے یہاں صرف ۲۶

چھیاسٹھ عدد لئے جائیں گے اور دوسرے میں دو یا شمار کر کے ۷۶ چھہتر عدد لئے جائیں گے۔ آپ کہیں گے ہمزہ اصلی اور نقلی کیا ہوتا ہے تو عرض ہے کہ قرآن کریم میں ایک آدھ جگہ ہمزہ بطور حرف بھی آیا ہے۔ مثلاً یہ آیت مبارکہ یورثھا من یشاء۔ میں ہمزہ اصلی ہے چنانچہ علامہ عبدالجلیل بلگرامی نے بادشاہ فرخ سیر کے سال جلوس کی تاریخ بھی اسی سے نکالی جو ہمزہ شمار کر کے ۱۱۲۴ھ بنتی ہے اسی طرح لفظ جاء بھی ہے۔

مشدد حرف کے سلسلہ میں بھی یائے مشدد ہو یا کوئی اور حرف مشدد یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ہر حرف مشدد کے صرف اکہرے عدد لئے جائیں گے یعنی مشدد حرف کو دوبار شمار نہیں کیا جائے گا جیسے سرکار رسالت مآبؐ کے اسم گرامی (محمدؐ) میں دو مرتبہ میم مشدد ہے لیکن قاعدہ جمل میں اس کے ایک ہی بار چالیس عدد شمار کیے گئے ہیں۔ ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ لفظ اللہ میں بھی لام مشدد ہے تو یہاں دو لام کیوں شمار کیے گئے تو جواب یہ ہے کہ لفظ اللہ میں تشدید ہونے کے باوجود دو لام اس لئے شمار کیے گئے ہیں تاکہ اس کی صفت اُسے ممتاز رہے۔ لفظ اللہ۔ ال الٰہ کا مخفف بھی ہو سکتا ہے اس لئے بھی دو لام درست ہیں۔

البتہ بیس، علیین میں دو بار شمار کر کے بیس عدد لئے جائیں گے۔ جیسے حضرت امیر مینائی کے دیوان کا تاریخی نام ہے محامد خاتم النبیین ۱۲۸۷ھ۔ اسی طرح تسلیم سہسوانی جو فن تاریخ گوئی کے استاد تھے انہوں نے فن تاریخ گوئی پر جو کتاب لکھی اس کا تاریخی نام عدد التاریخ رکھا۔ یہاں تائے مشدد کے صرف ۴۰۰ عدد لئے ہیں اور اسی کتاب میں وہ خاتم النبیین میں دو ی شمار کر کے ۱۱۹۴ لکھتے ہیں۔ اگر بیین، علیین وغیرہ میں کسی نے تین یے شمار کی تو اس سے سہو ہوا۔

عربی الفاظ میں ''ت'' کا حرف دو طرح کا ہوتا ہے ایک گول جسے پنجاب میں لاہور والی ہ کہا جاتا ہے اردو میں صرف ہ کہتے ہیں اور عربی میں اسے تائے مدورہ کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر جنۃ الماوٰی اور رحمۃ اللعالمین دونوں صورتوں میں آواز تو ضرور ''ت'' کی نکلتی ہے لیکن املا اور اصول کے اعتبار سے اسے ہائے ہوز شمار کیا جائے گا اور عدد بھی پانچ ہی شمار ہوں گے۔

تائے مدورہ اور تائے طویلہ دونوں کا املا قرآن کریم میں موجود ہے لفظ رحمت قرآن کریم میں سات جگہوں پر واقع ہے اور لفظ رحمۃ اکثر جگہ تائے مدورہ سے ہے، چنانچہ کسی نے یہ قطعہ کہا۔

رحمت اندر کلام ربانی ۔۔۔ ہفت باشد بتائے طولانی
ہود، اعراف، مریم و بقرہ ۔۔۔ روم و زخرف، ہاول و ثانی

یعنی سورہ زخرف میں اول و آخر ایک آیت ۔۔۔۔ رحمت ربک ۔ رحمت ربک ۔ دو مرتبہ آئی ہے ۔ تائے مدورہ اور تائے قرشت (طویلہ) کے درمیان جو فرق ہے اسے ضرور سمجھ لینا چاہیے تا کہ جہاں تائے طولانی ہو وہاں ۴۰۰ عدد شمار کیے جائیں اور تائے مدورہ کی طرح پانچ عدد نہ لئے جائیں ۔ علامہ شفق گنجینۂ تاریخ میں لکھتے ہیں ۔

> "ہائے اصلی ۔ جو الحاق نہ ہو اصل حروف مادہ سے ہو جیسے "وقت" میں تائے ضمیر جس سے ضمیر کی پہچان ہوتی ہو جیسے ۔ ضربت میں تائے جمع ۔ جو جمع مونث کی خاص علامت ہو جیسے ۔ مسلمات میں ۔ تائے مدورہ کی مابہ الامتیاز خصوصیت یہ ہے کہ وہ بہ حالت سکون و وقف صریحاً ہوز ہو جاتی ہے اسلئے الف لام عربی کے ساتھ ملنے میں آواز اس کی نہ بدلے مگر صورت وہی رہ جاتی ہے کہ تائے طویلہ سے ممتاز رہے جو بہ حالت سکون و وقف بھی اپنی حالت پر رہتی ہے جیسے "الکلام المبین فی آیٰت رحمتاً للعٰلمین" یہ مفتی عنایت احمد مرحوم کی ایک کتاب کا تاریخی نام ہے جس سے ۱۲۶۱ھ نکلتا ہے آیٰت کی تائے طویلہ ہے اس کے چار سو عدد لئے گئے اور رحمۃً للعٰلمین میں تائے مدورہ ہے اسکے پانچ عدد لئے گئے"۔

ابجدی تاریخ گوئی کی ابتداء: مجھے برصغیر اور برادر اسلامی ملک ایران کے قدیم عربی ادب میں فن تاریخ گوئی کا کوئی سراغ نہیں مل سکا اور نہ ہی میں نے عربی ادب کو کھنگالنے کی کوشش کی اس لئے کہ میں بطور زبان عربی سے ناواقف ہوں ۔ البتہ فارسی زبان میں فقرے مصرعے اور قطعات تاریخی پائے جاتے ہیں اور چونکہ ہمارا ادب خصوصیت سے شعری ادب سارے کا سارا ایرانی شاعری سے مستعار ہے اسی طرح کی تشبیہات و استعارات، تراکیب، صنائع بدائع اوزان و بحور تقطیع وغیرہ وغیرہ اور رباعی تو خیر ہے ہی ایران کی ایجاد، تو ظاہر ہے کہ جب ہمارے یہاں یعنی برصغیر میں اردو شاعری کا آغاز ہوا بلکہ جب ابتدائی اردو جسے دکنی یا ریختہ بھی کہا گیا اس کا رواج ہوا تو فارسی کی تقلید اور اصناف کے ساتھ تاریخ گوئی بھی آئی ۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ ایران میں کب شاعری کا آغاز ہوا اور کس نے سب سے پہلے ابجدی تاریخ کہی ۔ ہم مختصر طور پر یوں کہہ سکتے ہیں فارسی شاعری کے اولین دور کے شعراء میں رودکی، فارابی فردوسی وغیرہ جیسے نامور شاعر موجود ہیں ۔ لیکن فردوسی کے سوا کسی کے یہاں بھی تاریخ گوئی کا اشارہ بھی نہیں ملتا ۔ اور اسی کے یہاں الفاظ میں سنین کا تذکرہ ملتا ہے ۔ یہ چوتھی صدی ہجری کی بات ہے جب فارسی زبان ترقی کے ابتدائی مراحل میں تھی ۔ ایران میں قدیم ترین صوری تاریخ یعنی لفظوں میں بیان کی گئی قدیم ترین تاریخ میری تحقیق کے مطابق فردوسی کی ہے جو مثنوی

نہیں ہے یعنی ایسا نہیں ہے کہ ہم بیان کردہ الفاظ کے اعداد کو یک جا کریں تو سن مطلوبہ حاصل ہو جائے جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے۔ فردوسی نے یہ تاریخ اس وقت کہی جب وہ شاہنامہ مکمل کر چکا تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ دوسروں کو شاہنامہ مکمل کرنے کا سن بتانا چاہتا تھا چنانچہ کہتا ہے۔

زہجرت شدہ پنج ہشتاد بار　　　　که گفتم من ایں نامۂ شہریار

اس میں ایک خوبی یہ ہے کہ ۵ کو ۸۰ سے ضرب دیں ۵×۸۰=۴۰۰ھ سن مطلوبہ برآمد ہوتا ہے اور اس تاریخ کو بیان کرنے میں ندرت یہ ہے کہ جب شاہنامہ مکمل ہوا اور فردوسی نے تاریخ کہی تو اس وقت فردوسی کی عمر بھی ۸۰ برس تھی۔ واللہ اعلم

اعجاز التواریخ کے بقول حروف ابجد کے اعداد کے مطابق شاید قدیم ترین مادہ تاریخ خاقانی (م ۵۹۵ھ) نے کہا ہے جمال الدین اصفہانی محمد علی بن علی بن ابی منصور کی مدح میں اپنے قصیدہ میں لکھتا ہے:

درسنہ قانون الف بہ حضرت موصل　　　　راندم "قانون الف" سزای مدحان

"ش ن ا" کے حروف کا عددی میزان ۵۵۱ بنتا ہے۔ چھٹی صدی ہجری کا دوسرا مشہور شاعر نظامی گنجوی ہے وہ اپنی مثنوی لیلی و مجنوں کا سال تکمیل یوں لکھتا ہے:

آراستہ شد بہ بہتریں حال　　　　در سلخ رجب ب ش و ف دال

تاریخ عیان کہ داشت باخود　　　　ہشتاد و چہار بعد پانصد

حروف "ش ف د" کا عددی مجموعہ ۵۸۴ بنتا ہے، لیکن خمسہ نظامی کی دوسری مثنویوں کا سال نظم بیان کرنے میں نظامی نے حروف ابجد کو نظر انداز کیا ہے اور واضح طور پر مثنوی کا سال تصنیف بیان کر دیا ہے۔ چنانچہ مثنوی خسرو و شیریں کی تاریخ تکمیل یوں بیان کی ہے:

گذشتہ پانصد و ہفتاد و شش سال　　　　نزد بر خط خوباں کس چنیں فال

ساتویں صدی ہجری ایرانی مغلوں کا زمانہ ہے۔ اس وقت بھی ابجد کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی اور تاریخ ہائے واقعات کو حروف ابجد سے استفادہ کے بغیر صریح اور واضح انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ خواجہ نصیر الدین طوسی (م ۶۷۲ھ) نے ہلاکو کے ہاتھ اسمٰعیلیوں کی طاقت کے نابود ہونے کی تاریخ یوں کہی ہے

سال عرب چو ششصد و پنجاہ و چار شد　　　　یکشنبہ روز اول ذیقعدہ بامداد

خور شاہ پادشاہ سماعیلیاں ز تخت　　　　برخاست پیش تخت ہلاکو بایستاد

فارسی نظم میں مسعود سعد، انوری، خاقانی، ظہیر فاریابی اور فرید نسوی نے جو شاعر ہونے کے ساتھ نجم اور ریاضی

دان بھی تھے۔ سہ حرفی مہمل مرکبات آحاد و عشرات و مات سے استفادہ کیا اور تاریخ گوئی میں ایسے الفاظ کا استعمال کیا ہے جو معنوی اعتبار سے بھی خاص اہمیت کے حامل ہیں خاقانی ۵۵۱ھ میں جمال الدین اصفہانی سے اپنی ملاقات کی تاریخ کا ذکر کرنے کے لئے حروف "ث ن ا" کی طرف متوجہ ہوتا ہے جہاں لفظ "ثنا" کے مجموعی عدد سال ملاقات کو ظاہر کرتے ہیں وہاں یہ ایک شاہی وزیر کی مدح کے لئے موزوں لفظ بھی ہے اسی طرح جب کسی نے اپنی یادداشت کے لئے شیخ سعدی شیرازی کی تاریخ وفات لکھنا چاہی تو ۶۹۱ھ کی بجائے "خ ص ا" سال ی "خاص" رقم کیا جس میں بیک وقت لفظی، معنوی اور عددی اہمیت پائی جاتی ہے۔

منتخبات مونس الاحرار آٹھویں صدی ہجری کی تصنیف ہے اس کے باب تواریخ سے واضح ہوتا ہے کہ اس صدی میں مادہ تاریخ گوئی ادبیات میں شامل ہو چکی تھی اس کے بعد وہ مادہ تاریخ گوئی منظم طور پر آگے بڑھی۔ "حیف از شاہ شجاع" اور "خاک مصلیٰ" علی الترتیب شاہ شجاع اور حافظ شیرازی کے مادہ ہائے تاریخ وفات ہیں جو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ آٹھویں صدی سے پہلے مادہ تاریخ گوئی نے اپنے ابتدائی مراحل طے کئے اور اس صدی میں تاریخ گو شعراء اسے کمال کی طرف لے گئے آٹھویں صدی کے بعد مادہ تاریخ گوئی نہ صرف تاریخی وادبی بلکہ فنی اعتبار سے بھی عروج پر رہی ہے جس کا صحیح اندازہ آٹھویں صدی سے لے کر آج تک کے تاریخ گو حضرات کے آثار کے مطالعہ سے ہوتا ہے یہاں اس تفصیل کی گنجائش نہیں۔ (ماخوذ از اعجاز التواریخ)

عددی تاریخ کے بارے میں اعجاز التواریخ کے مرتب جناب عارف نوشاہی کے مطابق: ان فارسی قطعات کے علاوہ بہت کم تاریخیں ایسی ہوں گی جو چھٹی صدی ہجری میں معنوی طور پر کہی گئی ہوں یا پانچویں صدی میں کہی گئی ہوں البتہ کچھ لوگوں نے خود ہی (ذاتی طور پر) دوسری صدی ہجری کی بعض نامور شخصیات کی تاریخ وفات نکالی ہے۔ مجھے ایسے مادہ ہائے تاریخ کہنے والوں کے اسمائے گرامی تک رسائی نہیں ہو سکی مثال کے طور پر گنجینۂ تاریخ مصنفہ حضرت علامہ شفق عماد پوری میں یہ تاریخیں درج ہیں وہ لکھتے ہیں:

امام ابو حنیفہ نے سر بہ سجدہ وفات پائی تھی تاریخ وفات نکلی ۔۔۔ امام ساجد ۔۔۔ ۱۵۰ھ

امام مالک کی تاریخ وفات کسی نے کیا بے ساختہ کہی ۔۔۔ آہ امام مالک ۔۔۔ ۱۷۹ھ

حضرت جنید بغدادی کی تاریخ وصال کہی گئی ۔۔۔۔۔۔ جنید واصل حق ۔۔۔ ۳۰۱ھ

حضرت شبلی کی تاریخ وصال ان کے نام ہی سے نکلتی ہے ۔۔۔ شبلی ۔۔۔۔۔۔ ۳۳۲ھ

اب یہ واضح نہیں ہوتا کہ یہ تاریخیں کس نے نکالی ہیں خود شفق صاحب نے اپنا نام نہیں دیا بلکہ یہ کہا کہ "کسی نے

کیا بے ساختہ کہی" سوال یہ ہے کہ وہ کون تھا اور بنیادی بات یہ ہے کہ یہ تاریخیں جن کا تعلق دوسری صدی ہجری سے ہے، کس سن میں کہی گئیں۔ تاریخ گو کا نام معلوم ہو جائے تو سن کا تعین بھی ہو جائے گا۔ گمان غالب یہی ہے کہ معتقدین نے بہت بعد میں از راہ محبت مادہ تاریخ نکالا لیکن آج ان لوگوں کے نام سے کم سے کم میں واقف نہیں ہوں۔

اسی طرح واقعہ کربلا کی تاریخیں بھی کئی شعراء نے نکالی ہیں جبکہ دوسری ہجری میں نہ فارسی زبان کا عروج تھا نہ تاریخ گوئی کا اس کے باوجود بعد میں مدح خوانِ شہدائے کربلا نے اس حادثے کی تاریخ ضرور نکالی۔ لیکن بعض لوگوں نے یا تو تاریخ سے عدم واقفیت کی بنیاد پر یا معلوم نہیں کیوں غلط مادہ تاریخ نکالا یعنی جو واقعہ متفقہ طور پر دس اکتوبر ۶۸۰ء بروز بدھ مطابق دس محرم ۶۱ھ کو ہوا اسے ۶۰ھ کا ثابت کرنے کی نامناسب کوشش کی گئی۔ شاید ضامی کے چکر میں ایسا ہوا ہو لیکن ہوا غلط اور آج بھی بعض دوست ایسی غلط تاریخوں کی بہت تشہیر کرتے ہیں۔ مثلاً ایک تاریخ دیکھئے جس میں شاعر نے اپنے عقیدے کے مطابق پنجتن کی تاریخ ایک لفظ یا سن سے نکالی ہے یہاں پورا قطعہ نہیں صرف آخری شعر درج کر رہا ہوں لفظ یاسن ذہن میں رکھئے گا۔ ی۔ ا۔ س۔ م۔ ن

اول دو حرف بہر محمد و فاطمہ   باقی سہ حرف بہر حسین وعلی حسن

گویا شہادت حسین ۶۰ھ میں ہوئی تھی ظاہر ہے یہ بات تاریخی اعتبار سے غلط ہے۔ اسی طرح اسی واقعہ کی ایک اور تاریخ مشہور ہے جس میں صنعت گری بھی ہے۔

سر جدا شد از حسین دگشت تاریخ آشکار   ہم ز حرف بے نقط ہم از حروف نقطہ دار

یہ تاریخ بیک وقت صنعت منقوطہ میں بھی ہے اور غیر منقوطہ میں بھی اور دونوں جگہ شہادت حسین کو ۶۰ھ لکھا گیا اور یہ بھی تاریخی حقائق کے منافی ہے۔

ایک اور صاحب نے لفظ دین سے سال ولادت ووفات نکالا۔

سر دیں سال از ولادت او   حرف باقی بداں شہادت او

یا "سر دیں را بریدہ بے دینے" دونوں جگہ شہادت حسین کو ۶۰ھ کا واقعہ لکھا گیا اب یا تو یہ مان لیا جائے کہ سارے مورخ جھوٹے ہیں یا پھر یہ کہ شعرا نے غلط بات کو فروغ دینے کی کوشش کی خواہ دانستہ ہو یا نادانستہ۔ اور یہ بات سراسر لوگوں کو تاریخ سے گمراہ کرنے کے مترادف ہے۔ یہ تمام تاریخیں واقعہ کربلا کے بہت بعد کہی گئی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس دوران میں ایران میں کہی گئی ہوں گی جب تاریخ گوئی معنوی اعتبار

سے بھی اپنے پورے عروج پر پہنچ چکی تھی اور اس میں شعرا اپنی جودت طبع اور صناعی اور انداز بیان پر اپنی قدرت کا اظہار کرنے کے لائق تھے۔ حیرت ہے کہ پھر بھی ۶۱ ھ کی جگہ ۶۰ ھ لکھا۔

معنوی تاریخوں اور صوری و معنوی دونوں طرح کی تاریخوں کا سراغ ہمیں چھٹی صدی ہجری سے ملنا شروع ہو جاتا ہے مثال کے طور پر نظامی گنجوی کی یہ تاریخ دیکھیے۔ نظامی گنجوی نے بادشاہ کے حکم اور اپنے بیٹے کی تحریک پر مثنوی لیلیٰ مجنوں لکھی اور چار مہینے میں جب مکمل کی تو اختتام مثنوی کے وقت رجب ۵۸۴ ھ تھا۔ اس کا تاریخی قطعہ دستیاب ہے۔ اسی شاعر کی دوسری مثنوی سکندر نامہ بحری ہے جو اس نے ۶۳ سال کی عمر میں لکھی تھی اس کا اظہار وہ یوں کرتا ہے۔

نظامی چو ایں داستاں شد تمام   بہ عزم شدن تیز برداشت گام
فزوں بود شش مہ ز شصت و سہ سال   کہ بر عزم رہ بر دہل زد دوال

یعنی ۶۳ برس چھ ماہ۔ چھٹی صدی ہجری کے کچھ اور مادہ ہائے تاریخ بھی دیکھیے جس سے اس بات کی تصدیق ہو جائے گی کہ اس صدی کے شعرا صوری و معنوی دونوں طرح کی تاریخیں کہنے لگے تھے بطور نمونہ چند مادے ملاحظہ فرمائیے۔ شیخ عبدالقادر جیلانی کو بقول شفق عماد پوری مقام ولایت میں درجہ عاشق و معشوق دونوں حاصل تھا چنانچہ کسی عقیدت مند نے تاریخ کہی:

ز عاشق سال پیدائش ہویدا   وصالش داں ز معشوق الٰہی
۴۷۱ ھ   ۵۶۲ ھ

حضرت خواجہ معین الدین چشتی کا سال ولادت و وفات دیکھیے:

ولادت "عاشق تو" سال عرش   بود در "والی ہند" آشکارا
۵۲۷   +   ۱۰۶   = ۶۳۳ ھ

وفاتش آفتاب ملک ہند ست   ز ابجد کن شمار ایں راخدارا
۶۳۳ ھ

پہلے مصرعے میں یہ ندرت ہے کہ "عاشق تو" سے سال ولادت نکلتا ہے اور اگر اس میں "والی ہند" کے ۱۰۶ جمع کریں تو ۶۳۳ سال وفات بن جاتا ہے اور دوسرے مصرعے میں صرف سال وفات ہے۔

شیخ سعدی (م ۶۹۱ ھ) نے بوستان مکمل کی تو اس وقت ۶۵۵ ھ تھا انہوں نے یوں تاریخ کہی۔

بروز ہمایون و سال سعید   بتاریخ فرخ میان دو عید

زشش صد فزوں بود پنجاہ و پنج   کہ پرور شد ایں نام بردار گنج

برصغیر میں فن تاریخ گوئی: یہ تو تھا فارسی شاعری خصوصاً ایران کی شاعری میں تاریخ گوئی کے ارتقا کا مختصر جائزہ ضمناً برصغیر کی بھی ایک دو تاریخوں کا ذکر آ گیا اور آئیے اب دیکھتے ہیں کہ برصغیر میں فن تاریخ گوئی کا رواج کب سے ہوا۔

اردو شاعری میں تقریباً تمام اصناف فارسی سے آئی ہیں چنانچہ تاریخ گوئی بھی آئی اور چوں کہ اردو زبان وادب کا آغاز جنوبی ہند سے ہوا لہٰذا اس ضمن میں بھی ہمیں اردو ہی کو دیکھنا پڑے گا۔ سلطان قلی قطب شاہ اب تک کی تحقیق کے مطابق اُردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے میں نے یہ دیوان نہیں دیکھا۔ کہتے ہیں اس میں تمام اصناف شعری ہیں لیکن کسی نے تاریخ گوئی کا ذکر نہیں کیا دیوان دیکھ کر معلوم ہو سکتا ہے۔ قصہ لیلیٰ مجنوں' کا ترجمہ ۱۰۴۰ھ میں عاجز دکنی نے کیا۔

ہزار اور چہل تھے یوں ہجرت کے سال   ہوئے تب کیا مجنوں لیلیٰ کا حال

گویا گیارہویں صدی ہجری کے آغاز تک دکن میں معنوی (عددی) تاریخ کا رواج نہیں ہوا تھا یا پھر میری رسائی نہیں ہوئی۔ یعقوب کشمیری نے نظامی گنجوی کی تقلید میں مثنوی وامق وعذرا ۹۹۳ھ میں لکھی اور اس کی تاریخ اس طرح نکالی: کہ تاریخش بود معشوق و عاشق (۵۱۶+۴۷۷=۹۹۳ھ)

مولانا عبدالرحمٰن جامی متوفی ۸۷۸ھ نے مثنوی یوسف زلیخا ۸۸۹ھ میں مکمل کی اور اس طرح تاریخ کہی۔   نہم سال از نہم عشر از نہم صد

یعنی نویں صدی کے نویں عشرے کے نویں سال میں مکمل ہوئی۔ یہ درسی کتاب تھی اور لاہور و دہلی سے کئی بار چھپی (ترجمہ ہائے متون فارسی صفحہ نمبر ۲۸۰)

البتہ ۱۱۴۱ھ کا ایک مادہ تاریخ مجھے دستیاب ہوا ہے اس کا پس منظر یہ ہے کہ ارکاٹ (مدراس) کے ایک قدیم شاعر غوثی ارکاٹی نے جنہیں بعض مصنفین نے دکنی بھی لکھا ہے انہوں نے اپنی ایک مثنوی روضۃ الشہد اکمل کی تو اس کی تاریخ بھی خود کہی اور یہ صوری تاریخ ہے اور روضۃ الشہد اکو "دہ مجلس" کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

ہوا ہے ختم جب یوں درد کا حال   گیارہ سو تھا اکتالیسواں سال (۱۱۴۱ھ)

ان کی دوسری دو مثنویوں کی تاریخیں بھی دیکھیے۔ شیخ عبدالقادر جیلانی کے سوانح ومناقب پر ایک فارسی مثنوی کا ترجمہ کیا اور تاریخ کہی:

باغ جو باغاں کوں سارے داغ ہے   اس کی تاریخ "عندلیب" "باغ" ہے
۱۱۶۹ھ

دواوین کے تاریخی ناموں کے سلسلے میں مجھے اب تک سب سے پہلے جو نام مل سکا اس کا مختصر حال یہ ہے کہ شاہ تراب ترناپلی (مدراس) کے ایک مشہور صوفی اور بزرگ شاعر تھے۔ جب ان کا دیوان چھپا تو تاریخی نام رکھا گیا: ظہور کلی   ۱۱۷۱ھ

وجیہہ الدین وجدی دکنی نے پنچھی باچھا کے عنوان سے مثنوی لکھی جو ۱۱۵۵ھ میں مکمل ہوئی اس وقت تک دکنی میں آج کی اردو نہیں دکنی کا رواج تھا اور یہ تاریخ کہی:

جب کیا تاریخ کا دل میں حساب   تب ہوا میزاں میں کیا خاصی کتاب
۱۱۵۵

اس مادۂ تاریخ سے اس دور کی انداز تاریخ گوئی پر روشنی پڑتی ہے۔

تاریخ گوئی میں صنعت گری: شعرا نے تاریخ گوئی میں بھی فنی دسترس کا مظاہرہ کیا ہے اور اس فن میں صنعت گری کے کمالات دکھائے ہیں۔ یہ صنائع معنوی بھی ہیں اور صوری بھی اور ان کے مختلف نام رکھے ہیں مثلاً زبر، بینات، زبر و بینات صنعت توشیح تعمیہ، تخرجہ تضارب وغیرہ الفاظ کے الٹ پھیر سے سن مطلوبہ کا برآمد ہونا یا جس طرح بات سے بات پیدا کی جاتی ہے اسی طرح کسی ایک لفظ کی معنوی حیثیت سے یا صوری حیثیت سے فائدہ اٹھا کر اس سے مطلوبہ سن حاصل کرنا یا کسی چیز، مقام، وغیرہ کی نسبت سے کوئی نادر پہلو پیدا کرنا اور اس سے سن مطلوبہ حاصل کرنا جیسے حافظ شیراز کی تاریخ وفات خاک مصلے سے نکالی گئی اسی طرح قیم الحق آزاد شیخ پوری کا تخلص ان کے استاد امیر مینائی نے سفیر سے بدل کر آزاد کر دیا تو ان کی جودت طبع نے تاریخ گوئی میں یہ ندرت پیدا کی۔

آزاد نکل آئے نہ کیوں سال تخلص   آزاد کے اعداد جو دوبار رقم ہوں   یعنی آزاد+آزاد=۱۳۱۲ھ

داغ کے انتقال کی تاریخ علامہ شفق نے یوں بھی کہی:

لے کے حروف معجمہ ہاتف غیب نے شفق   سال وفات کہہ دیا شاعر بے عدیل داغ

یعنی ش۔ب۔ی۔غ کا مجموعہ ۱۳۲۲ھ ہوتا ہے جو داغ کا ہجری سن وفات ہے۔ صنعتی تاریخیں۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے انتقال پر مومن نے کتنی بامعنی اور حسب حال و شخصیت کی ترجمان تاریخ کہی۔

دست بیداد اجل سے بے سرو پا ہو گئے   فقر و دیں فضل و ہنر لطف و کرم علم و ہنر

یعنی دوسرے مصرعے کے تمام الفاظ کے درمیانی حروف کے اعداد سے ۱۲۳۹ھ حاصل ہوتا ہے۔ ایسی ہی تاریخ نظیر اکبرآبادی کی وفات کی ہے: مخمس بے سروپا بیت سے دل فروبے سرشد (۱۲۳۶ھ)

ناسخ کی کہی ہوئی ایک پرلطف تاریخ دیکھئے۔ میر گھسیٹا نام کے کوئی صاحب مر گئے تو انہوں نے تاریخ کہی۔

جب میر گھسیٹا مر گئے ہائے — ہر ایک نے اپنے منہ کو پیٹا
ناسخ نے کہی یہ ان کے تاریخ — افسوس کہ موت نے گھسیٹا

۱۲۳۳ھ

صنعت توشیح: صنعت توشیح ایک ایسی شاعرانہ مناعی کا نام ہے کہ اس کے مصرعوں کا آغاز ایسے حروف سے کیا جائے جن کے مرتب کرنے پر یا کسی شخصیت کا نام برآمد ہو سکے یا مطلوبہ سن یا دو مختلف سنین برآمد ہوں۔ مثال کے طور پر اسی صنعت میں لکھے ہوئے اپنے دو قطعات تاریخ پیش کر رہا ہوں۔ پہلا قطعہ تاریخ ۱۹۵۰ء میں سر عبدالقادر کی وفات پر لکھا تھا جو نیرنگ خیال کے جوبلی نمبر میں شائع کیا گیا تھا اس میں عنوان کے بعد بطور وضاحت جو توصیفی کلمات لکھے۔ ان میں سے ہر جملہ بامعنی اور تاریخی ہے آپ بھی ملاحظہ فرمایئے۔

نجم شیخ

۱۹۵۰

قطعہ وفات حسرت آیات امام زبان داں۔ غضنفر رفیع قدر ۔ سخی شیریں سخن
۱۹۵۰ ۱۹۵۰ ۱۹۵۰

شریف ذی احترام۔ سخن ساز بے نظیر۔ آفتاب انجمن شیخ۔ عبدالقادر نوراللہ تربتہم
۱۹۵۰ ۱۹۵۰ ۱۹۵۰ ۱۳۶۹

۵۔ہ	ہائے زمانے سے آج اٹھا	۱۔ا	آئینہ عالم کا ناظر
۳۔ج	جس کی زیست کا اک اک لمحہ	۶۔و	وقف تھا قوم و ادب کی خاطر
۴۰۔م	مکر سے پاک آئینہ دل تھا	۹۰۰۔ظ	ظاہر باطن، باطن ظاہر
۳۰۰۔ش	شان مروت مرتے دم تک	۳۔ج	جذبہ خدمت تادم آخر
۸۔ح	حاضر تھے ہر دم دل و جاں سے	۹۔ط	طالب علم و ہنر کی خاطر
۳۰۰۔ش	شکوا اجل کا کوئی کرے گا	۹۰۰۔ظ	ظاہر جو ہوتا تھا ہے ظاہر
۳۔ج	جان اردو شان اردو	۶۰۔س	سحر بیاں بے مثل و نادر

۵۰۔ن نظم ونثر میں کامل دیکھا ۱۰۔ی یعنی بیاں پر حاوی وقادر

۶۰۰۔خ خادم اردو محسن اردو ا+ا اردوداں اردو کے ماہر

۶۰۔س سال وفات قمر نے لکھا ۶۰۔س بزم محزن عبدالقادر (۱۳۶۹ھ)

مقطع کا دوسرا مصرعہ پورا تاریخی ہے اور پہلا حرف سین کے اعداد بطور تو شیح بھی شامل ہیں۔

تاریخ گوئی کی اقسام فنی اعتبار سے: فنی اعتبار سے اساتذہ نے تاریخ گوئی کی تین نمایاں اقسام مقرر کی ہیں۔اول وہ مادہ ہائے تاریخی یا تاریخی مصرعے جن سے پورا پورا سن واقعہ برآمد ہوتا ہو دوم وہ کہ کچھ اعداد کم ہوں اور ان کی کمی کو دور کرنے کے لئے پہلے مصرعے میں یا کسی مناسب جگہ اشارہ کر دیا جائے کہ فلاں لفظ کے اعداد کو شامل کرنے سے سن واقعہ برآمد ہوگا۔ایسی تاریخوں کو تعمیہ کہتے ہیں۔سوم وہ کہ مصرع تو بہت زوردار ہو مگر اس میں کچھ عدد زیادہ ہو گئے ہوں تو کسی لفظ سے اشارہ کر دیا جائے کہ اس لفظ کے اعداد مکمل عدد سے منہا کر دیئے جائیں اسے تخرجہ کہیں گے۔حضور سرور کائناتؐ جب لوگوں کی ظاہری آنکھوں کے سامنے سے اُٹھا لئے گئے تو کسی نے تاریخ کہی: از محمد زمانہ خالی ماند (۹۶۔۱۰۳ = ۱۱ھ)

اسی طرح سیدنا علی المرتضیٰ کی شہادت کی تاریخ:

"بے گماں آخر دو حرف علی"۔علی سے عین نکال دیجئے: ل + ی = ۴۰ھ

الہامی تاریخیں: ایسے تاریخی فقرے یا مصرعے جنہیں پڑھیے تو واقعہ معلوم ہو جائے اور جب اس کے عدد نکالئے تو پورا پورا سن واقعہ برآمد ہو ایسی تاریخوں کو جناب سوز ناروی نے الہامی تاریخ قرار دیا ہے۔

جلیل مانکپوری جو نظام حیدرآباد کے استاد تھے انہیں نظام حیدرآباد نے سونے کی ایک گھڑی، سونے کے بٹن کا ایک سیٹ اور سونے کا توڑا مرحمت فرمایا تو جلیل نے تاریخ کہی:

گھڑی توڑا بٹن سونے کے اپنے شاہ سے پائے (۱۹۱۲)

نظام حیدرآباد کے بیٹوں کی شادی کے موقع پر سوز ناروی نے یہ تاریخی قطعہ لکھ کر نذر کیا:

یہ جشن یہ تقریب یہ جلسہ یہ مسرت عثمان علی خاں مرے آقا کو مبارک

اے سوز لکھی میں نے یہ تاریخ پئے نذر شہزادوں کی شادی شہ والا کو مبارک (۱۳۵۰ھ)

جلیل نے ۱۳۳۳ھ میں نظام کی سال گرہ کے موقع پر قطعہ کہا:

منارہ ہیں شہ نامدار سال گرہ لٹا رہی ہے و در شاہوار سال گرہ

زباں پہ مصرعۂ تاریخ بے بہا آیا مبارک اے شہ عالی وقار سال گرہ (۱۳۳۳ھ)

جلیل کی ایک اور تاریخ دیکھیے یہ انگوٹھی ملنے کے موقع پر کہی گئی:

سرفرازی دل نوازی کی نہیں ہے حد کوئی سرخرو کرتا ہے کیا لطف سلیمانی مجھے

کی عطا انگشتری تاریخ نکلی اے جلیل دی شہ یکتا نے یہ مہر سلیمانی مجھے (۱۹۲۹ء)

ایسی بہت سی تاریخیں پیش کی جا سکتی ہیں جنھیں الہامی کہا جا سکتا ہے۔ دوسرے درجے پر شاعرانہ تاریخیں ہیں یعنی ایسے مصرعے جن میں واقعہ کی طرف اشارہ بھی ہو اعداد بھی پورے ہوں اور اس میں کوئی نہ کوئی رعایت لفظی بھی ہو مثلاً امیر مینائی کے انتقال پر داغ نے تاریخ کہی۔

قصر عالی پائے جنت میں امیر (۱۳۱۸ھ)

نواب یوسف علی خان کے انتقال پر امیر مینائی نے تاریخ کہی: مسند آرائے جناں شد یوسف دوران من

معروف نعتیہ شاعر میرے محب خاص حضرت ہلال جعفری ۱۴-۱۵ اکتوبر کی درمیانی شب اچانک انتقال کر گئے۔ معراج کی رات تھی۔ میں نے تاریخ کہہ کر دل کا بوجھ ہلکا کیا۔

ہلال دیدہ و دل ابر رحمت میں ہے پوشیدہ ۱۴۲۶ھ

تیسرے درجے پر سادہ تاریخیں ہیں یعنی جن میں نہ رعایت لفظی ہے نہ کوئی صنعت گری مثلاً ایک درویش صفت بزرگ کے انتقال پر کسی نے تاریخ کہی: اٹھ گیا آج آہ وہ درویش کامل دہر سے (۱۳۴۸ھ)

زبر و بینات: زبر سے مراد ہے کہ جو حرف جس طرح لکھا گیا ہے اسی شکل کے عدد شمار ہوں گے مثلاً ج۔ ق۔ ل کے ۳-۱۰۰-۳۰ وغیرہ

بینات۔ اگر کسی حرف کو اس طرح لفظ کی شکل میں لکھا جائے جس طرح تلفظ میں ادا ہوتا ہے مثلاً ج کو جیم۔ ق کو قاف 'ل' کو لام 'د' کو دال تو اسے بینات کہیں گے جیسے کسی نے دیوان ناسخ کی تاریخ نکالی۔ "دیوان سخن"

دال--	ے--	واو--	الف--	نون--	الف--	سین--	خ
۳۵	۲۰	۱۳	۱۱۱	۱۰۶	۱۱۱	۱۲۰	۶۱۰

کبھی کبھی ایک ہی مادہ تاریخ میں زبر و بینات دونوں کا استعمال ہوتا ہے مثلاً مولانا شوق نیموی کے دیوان چھپنے کی تاریخ علامہ شفق نے اس طرح نکالی:

د--	ی--	و--	ن--	ش--	و--	ق--	۴۷۷
دال--	یے--	واو--	نون--	شین--	واو--	قاف	۸۳۹

۱۳۱۶ھ

یعنی ایک لفظ دیوان شوق کو زبر اور بینات دونوں صورتوں میں استعمال کر کے مطلوبہ سن تاریخ حاصل کیا گیا۔ یہ درہے کہ تاریخ میں ہمزہ زیر زبر پیش کے عدد نہیں ہوتے۔ عموماً لوگ زبر میں تاریخ کہتے ہیں لیکن ایسے ایسے باکمال استاد بھی ہوگزرے ہیں جن کا ثانی بھی مشکل سے ملے گا ان صاحبان علم وفن کی عظمت کو سلام جنہوں نے اس میدان خارزار کو اپنی محنت اور حسن تخلیق سے سدا بہار گلستاں بنا دیا۔

آیئے بزرگوں کے جواہر ریزوں سے دیدہ دل منور کرتے ہیں۔ خورشید علی تقوی مہر جے پوری مرحوم کے ایک طویل مضمون مطبوعہ فیض الاسلام جنوری، مارچ ۱۹۶۴ء سے اقتباس ملاحظہ ہو:

(الف) آقا طہماسپ قلی تخلص بہ ترکی نے بموقع جلوس دارا شکوہ بہ ۱۰۴۳ھ انیس شعروں کا قصیدہ لکھا جس کے ہر مصرعے سے ۱۰۴۳ھ حاصل ہوتا ہے اور ہر شعر کے منقوطہ حروف سے جداگانہ اور غیر منقوطہ سے علیحدہ یہی سن نکلتا ہے بطور نمونہ ایک شعر درج کرتا ہوں۔

بحمد اللہ کہ شد دیگر زہی نائب سلطاں	رواج التیام افزوں حدود وصل آباداں
۱۰۴۳ھ	۱۰۴۳ھ

اسی قصیدے سے یہ صنعت توشیح جو شعر بنتا ہے یہ اور اضافہ اور تنوع ہے کہ ہر مصرع کے مجموعی اعداد تو ۱۰۴۳ ہیں ہی، مگر اس شعر میں ہر مصرع کے حروف منقوطہ سے ۷۸۱ حاصل ہوتے ہیں اور غیر منقوطہ حروف سے ۲۶۲ اور اس طرح کل تعداد ۱۰۴۳ قائم کی ہے۔

(ب) باقر گیلانی نے ۱۰۶۸ھ میں اسی شرط کے ساتھ ایک نعتیہ قصیدہ کے متعدد اشعار لکھے جن کے ہر مصرعے کے مجموعی اعداد ۱۰۶۸ ہوتے ہیں اور ہر مصرع میں یہ بھی التزام کیا ہے کہ منقوطہ حروف کے اعداد بھی ۵۳۴ ہی ہیں اور غیر منقوطہ حروف کے بھی۔

(ج) ہر بہائے وہبی سہسوانی نے اسی شرط کے ساتھ ۱۱۸۰ھ میں قصیدہ لکھا، جس کے ہر مصرعے کے حروف منقوطہ سے نیز غیر منقوطہ سے یکساں اعداد ۵۹۰ حاصل کیے ہیں۔

عشوہ را عود کن اے ساقی سیمیں اندام	تا بدرد مکلا رادق گلفام بجام

منقوط (۸۹۰) ۱۱۸۰ھ غیر منقوط ۸۹۰ منقوط (۸۹۰) ۱۱۸۰ھ غیر منقوط ۸۹۰

(د) مولانا محسن کاکوروی نے اپنے دوست مولوی امجد علی بلیغ کے عقد (بہ ۱۲۶۴ھ) کی تاریخ حسب ذیل کہی:

مبارک آمد ز کتخدائی مے وصال مدام امجد — دمید عید امید ازیں مہ بہ چار، ستون و الف دو دو صد

۱۲۶۴ھ — ۱۲۶۴ھ

اس شعر سے سات طرح تاریخ حاصل ہوتی ہے

(۱) صوری تاریخ۔ یعنی الف و دو صد و چار و ستون (یک ہزار دو صد و شصت و چار ۱۲۶۴ھ)

(۲) معنوی تاریخ۔ مصرعہ اول کے اعداد ۱۲۶۴ ہوتے ہیں۔

(۳) معنوی تاریخ۔ مصرعہ دوم کے اعداد مجموعی بھی ۱۲۶۴ ہیں گو اسی میں صوری تاریخ بھی شامل ہے۔

(۴) دونوں مصرعوں (پورے شعر) کے غیر منقوط حروف کے اعداد بھی ۱۲۶۴ ہیں۔

(۵) دونوں مصرعوں (پورے شعر) کے منقوط حروف کے اعداد کا مجموعہ بھی ۱۲۶۴ ہوتا ہے۔

(۶) پہلے مصرعہ کے غیر منقوط اور دوسرے کے منقوط حروف کے اعداد کا مجموعہ بھی ۱۲۶۴ ہے۔

(۷) پہلے مصرعہ کے منقوط اور دوسرے کے غیر منقوط حروف کے اعداد کا مجموعہ بھی ۱۲۶۴ ہی ہے۔

نتائج تحقیق:

☆ فارسی اردو شاعری کی تاریخ میں سب سے پہلے ایران میں تاریخ گوئی کا رواج ہوا۔

☆ میری تحقیق کے مطابق فردوسی پہلا ایرانی شاعر ہے جس کے یہاں صوری مادہ تاریخ پایا گیا ہے۔

☆ سب سے قدیم معنوی تاریخ (فارسی زبان و ایران میں) خاقانی کے یہاں ملتی ہے جس سے ۵۵۱ھ برآمد ہوتا ہے۔

☆ حروف ابجد کے مجموعے عربی حروف پر مشتمل ہیں لیکن عربوں کے یہاں فن تاریخ گوئی کا سراغ مجھے نہیں مل سکا یوں بھی عربی زبان سے ناواقف ہوں۔

☆ اعداد کے نکالنے کے حروف کے مجموعے دو طرح کے ہیں اور دونوں کے نام الگ الگ ہیں۔

(۱) مشہور و معروف اور مروجہ ابجدی طریقہ جو زیر گفتگو ہے اس طریقے کو قاعدہ ابجد کہا جاتا ہے۔

(۲) دوسرا قاعدہ اجسث کہلاتا ہے لیکن اس میں مجھے نمونے نہیں مل سکے البتہ اس پر تجربہ کیا جا سکتا ہے کیوں کہ اس میں غیر عربی و غیر فارسی حروف بھی ہیں جو ہماری روزمرہ کی بول چال میں مستعمل

ہیں اور ان کے مترادفات ڈھونڈنے میں جو مشکلات ہیں ان سے بھی بچا جاسکتا ہے۔

☆ اس فن پر میری تحقیق کے مطابق سب سے پہلی کتاب ام التواریخ لکھی گئی جو تاریخی نام ہے یہ ۱۲۸۹ھ کی تصنیف ہے افسوس کہ مجھے مصنف کا نام معلوم نہیں ہوسکا۔

☆ انگریزی ادب میں فن تاریخ گوئی کا سراغ ملتا ہے اور سب سے پہلا مادہ تاریخ ۱۶۰۳ء کا ہے جو مجھے دستیاب ہوا اگر اس سے پہلے کا کوئی مادہ ہے تو مجھے معلوم نہیں۔

☆ میری تحقیق کے مطابق اس فن پر اب تک ۲۵ سے زیادہ کتابیں مطبوعہ ہیں اور کچھ قلمی مسودے ہیں ان کے علاوہ یقیناً اور کتابیں بھی ہوں گی لیکن ان تک میری رسائی نہیں ہوسکی میرا خیال ہے فن تاریخ پر لکھی جانے والی کتابوں میں سے اب تک غالباً تاریخ گوئی سے متعلق اتنے حوالے نہیں مل سکیں گے۔ الحمد اللہ کہ اس ناچیز کو اس نے یہ توفیق ارزانی فرمائی۔

کتابیات

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف مع سنہ تصنیف
۱	ام التواریخ	۱۲۸۹ھ (فن تاریخ گوئی پر اردو میں پہلی کتاب)
۲	سرو سہی یا خیابان تاریخ	(۱۲۹۲ھ) محمد علی جویا مراد آبادی
۳	آئینہ تواریخ	۱۲۹۳ھ
۴	فیض حلیم	(۱۳۰۰ھ) منشی انوار حسین تسلیم سہوانی
۵	افادہ تاریخ	(۱۳۰۲ھ) ضامن علی جلال لکھنوی
۶	زنبیل تاریخ	(۱۳۱۰ھ)
۷	گلشن تاریخ	(۱۳۱۳ھ) میر مہدی حسن الم
۸	غرائب الجمل	(۱۳۱۶ھ) عزیز جنگ ولا حیدرآباد
۹	عدد التاریخ	(۱۳۳۰ھ) تسلیم سہوانی
۱۰	اعجاز التواریخ	(۱۳۳۰ھ) مرتبہ سید شرافت نوشاہی
۱۱	گنجینہ تاریخ	(۱۳۳۹ھ) علامہ شفیق رضوی عمادپوری
۱۲	ملک تاریخ گوئی	(۱۳۵۲ھ) مولانا شاہد حسن سوز ناروی
۱۳	اساس التواریخ	(۱۳۷۰ھ) عمر ریتی قلمی مسودہ
۱۴	ترویج فن تاریخ	(۱۹۶۰ء)(۱۳۸۰ھ) صبا متھراوی
۱۵	عیون التواریخ	(۱۳۸۲ھ) سید غلام مصطفیٰ نوشاہی
۱۶	معاون تواریخ	(۱۳۸۴ھ) شوکت الہ آبادی
۱۷	فن تاریخ گوئی	(۱۳۸۷ھ) کیپٹن منظور حسن
۱۸	ذریع تاریخ	(۱۴۱۸ھ) نیساں اکبر آبادی
۱۹	در تاریخ	(۱۴۱۸ھ) حکیم متھراوی قلمی مسودہ
۲۰	چہار گلزار	----------------
۲۱	فن تاریخ گوئی	دائرۃ المعارف
۲۲	تاریخ ادبیات ایران، ڈاکٹر براؤن کا فارسی ترجمہ فتح اللہ مجتبائی	
۲۳	معدن الجواہر	بحوالہ درج تاریخ
۲۴	یاد رفتگان	صابر براری
۲۵	ماہنامہ فیض الاسلام	شمارہ جنوری تا مارچ ۱۹۶۳ء

ڈاکٹر محمد معز الدین

پاکستان میں مادری زبان کی تعلیم ۔ ایک لسانی جائزہ

واضح رہے کہ اساتذہ کے لئے مادری زبان اور دوسری زبانوں کی تعلیم میں فرق ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ دوسری زبان کے معلم کو زبان کی میکانیکی ترکیب بتانا ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف مادری زبان کے استاد کو ایسی زبان کی تعلیم دینی ہوتی ہے جس کے متعلق طلباء کو کم از کم بولنے اور لکھنے کی قدرے مہارت پہلے سے ہوتی ہے۔ اور بہتر طریقے سے شستہ زبان استعمال کرنے کی تعلیم دینی ہے۔ علاوہ ازیں اسلوب اور طرز نگارش کی مشق بھی کرانی ہے۔ لہٰذا یہ بنیادی فرق سمجھے بغیر کوئی استاد موثر طریقے سے درس نہیں دے سکتا۔

چھ سات سال کی عمر تک آتے آتے ایک بچہ اپنی زبان کے بنیادی صوتی نظام اور قواعد کے موٹے موٹے اصول کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کر لیتا ہے۔ اسے وہ باقاعدہ کلاس کے درس سے نہیں بلکہ وہ اپنے والدین سے سیکھتا ہے۔ یا بڑوں کو بولتے دیکھ کر سمجھ لیتا ہے۔ اس کے ہم عمر بچے اگر یہ غلط بولے تو اس کا مذاق اڑانا شروع کر دیتے ہیں۔ اب چونکہ اس کو زبان کو بولنے پر قدرت حاصل کرنی ہوتی ہے لہٰذا اس کا مسئلہ یہ نہیں ہوتا کہ وہ کیسے کہے بلکہ وہ کیا کہے مسئلے سے دوچار ہوتا ہے یعنی وہی مواد اور ہیئت والی بات سامنے آتی ہے، لہٰذا مادری زبان کی تعلیم دینے والے استاد کو طلباء میں جمالیاتی حس، اسلوب میں ندرت اور خیال میں گہرائی پیدا کرنے کی طرف توجہ دینی ہوتی ہے۔

اس امر کا ایک افسوسناک پہلو یہ ہے کہ مادری زبان کے استاد کو دوسری زبانوں کے استاد یا دوسرے مضامین کے استاد کے مقابلے میں زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی حالانکہ اگر اپنی زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے تو اس کی تعلیم پر سب سے زیادہ زور دینے کی ضرورت ہے اس کو سائنسی طور پر پڑھانے کی طرف توجہ دینی چاہیے تاکہ اس کا معیار بھی دوسرے مضامین کی طرح برقرار رہے کیونکہ اسی پر دوسرے مضامین کے خیالات کو بہتر اور موثر طریقے سے پیش کرنے کا دارومدار ہے۔

انگریزی کے ذریعہ دوسرے مضامین کو پیش کرنے میں تجربہ یہی کہتا ہے کہ جن کو جتنی قدرت اپنی زبان پر ہوگی وہ دوسرے مضامین میں بہتر نتائج حاصل کر سکتے ہیں۔

جدید لسانیات میں گرچہ زبان کے تقریری پہلو کے سائنسی تجزیہ پر زیادہ زور دیا جاتا ہے تاہم اس کے رسم الخط اور صوتی نظام کے تحت اگر غور کیا جائے اور تعلیم و تدریس کے لئے اس میں نئی ترتیب و تنظیم کی جائے تو نتیجہ یقینی بہتر ثابت ہوگا۔ مثلاً صوری اور معنوی دونوں لحاظ سے اگر حروف والفاظ اور معنی کا ربط نہ ہو تو شروع ہی سے الجھن پیدا ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر لفظ 'گ' کی جگہ اردو میں نفسی اور غیر نفسی آوازوں کی تدریس میں فرق نہیں کیا جاتا۔ 'گ' "ھ" (گاف، ہے) زبر 'گھ' پڑھایا جاتا ہے۔ حالانکہ صوتیاتی لحاظ سے یہ دو مختلف آوازیں ہیں اور دو الگ الگ صوتیے فونیمز (Phonemes) ہیں یعنی ان سے معنی میں فرق پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً بولا اور بھولا، گول اور گھول، چونا اور چھونا وغیرہ میں محض نفسی اور غیر نفسی آوازوں کے سبب مختلف معنی دیتے ہیں۔

طرفہ تماشا ہے بچوں کے لئے ابتدائی کتاب حروف شناسی کی لکھی جاتی ہے تو ایسی بھی مثال ہے کہ حرف تو "گ" ہے مگر تصویر بجائے گائے کے گھوڑے کی ہوتی ہے۔ ظاہر ہے مصنف نے آواز کی صوری شکل پیش کرنے کے لئے تصویروں کا دینا تو ضروری سمجھا مگر یہ نہ سوچا کہ گ سے گھوڑا کیسے بنا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حروف کی آواز کے لئے جو تصویریں بنائی جاتی ہیں ان سے صوتی علامات میں گڈمڈ ہونا لازمی ہے۔

یہ ایک مثال محض ابتدائی درجے کی کتاب سے دی گئی ہے۔ ہر سطح پر اس قسم کی مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً اعلیٰ سطح پر اگر کسی رکن یا لفظ پر اتار چڑھاؤ یا زور دینا ہے تو اس کا طلباء شعور نہیں رکھتے اور نہ اساتذہ ان کو بتاتے ہیں کہ ان سے صرف معنی میں فرق ہوتا ہے بلکہ ابہام پیدا ہونے کا امکان ہے۔ مثال کے طور پر اس جملے پر غور کیجئے۔ 'روکو مت جانے دو، روکو، مت جانے دو' بالکل متضاد مفہوم پیدا کر رہے ہیں۔ یہی غلطی اوپر کے درجے میں طلباء اشعار کو پڑھنے میں وزن، رکن اور بحر کا شعور نہ رکھنے سے کرتے ہیں، پرانے درسی نظام میں ابتدائی جماعتوں میں بھی اس کا درس دیا جاتا تھا۔ مگر رفتہ رفتہ یہ ختم کر دیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اچھے اچھے شاعروں کو خود اپنے اشعار پڑھتے وقت "بحر رجز میں ڈال کے بحر رمل چلے" والی صورت درپیش ہوتی ہے۔

اس طرح ہمارے یہاں رسم الخط کا مسئلہ ہے۔ صوتی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو مصوتے (Vowels) اور مصمتے (Consonants) دونوں کا ہمارے رسم الخط میں خلط ملط ہے۔ مثلاً اعراب یعنی زیر، زبر، پیش سے مصوتے بنتے ہیں اور حروف تہجی، الف سے بھی اور نیم مصوتے 'ی' سے بھی۔ قاعدے کی رو سے مصوتوں اور مصمتوں کی ترتیب ہونی چاہیے اور پھر زیادہ تر حروف جو صوتی علامات پیش کرتے ہیں صوری اعتبار سے مثلاً ب پ ت ٹ ث وغیرہ ایک ساتھ لکھے جاتے ہیں۔ مخرج اور ادائیگی کے لحاظ سے اگر ان کی ترتیب دے دی

جائے اور یہی نظام مروج ہو جائے تو یہ دوسری زبانوں میں جدید لسانیات کے اعتبار سے جو ترتیب دی گئی ہے۔اس سے ہم آہنگ ہو جائیگی۔اس لحاظ سے ہندی رسم الخط زیادہ سائنٹفک ہے۔ ہمارا قاعدہ انگریزی کے اعتبار سے یعنی A.B الف اور ب کی ترتیب ہے۔جس سے مصوتے اور مصمتے ملے ہوئے ہیں۔البتہ ایک اعتبار سے بہتر ہے کہ حروف تحریری اعتبار سے مشابہت رکھتے ہیں۔

ہمارے تعلیمی پروگرام میں انفرادی لحاظ سے طلباء کے پڑھنے کی صلاحیت ان کی عمر اور درجوں کے مطابق ہونی چاہیے۔اس پر توجہ بالکل نہیں دی گئی ہے۔

پاکستان میں مقامی زبانوں اور بولیوں کی تعداد زیادہ ہے مثلاً پنجابی' سندھی' پشتو' بلوچی' سرائیکی' ہندکو' پشتو ہاری' گجراتی وغیرہ۔ اردو چونکہ سرکاری اور مقابلتاً ایک اقلیت کی زبان ہے مگر اکثریت کی سرکاری زبان بھی ہے۔اس لحاظ سے ہم پر دو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں یعنی بعض علاقوں میں اردو کا درجہ زبان اول کا ہے۔اور بعض میں زبان دوئم کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر ان کی تعلیم و تدریس اسی مناسبت اور ضرورت کے لحاظ سے نہ کی گئی تو علاقائی تعصب سے قطع نظر فطری ترویج اور توسیع پر اس کا اثر پڑے گا اور یہ کام صرف اردو اخباروں کی تعداد بڑھانے' رسالوں میں اضافے' اسکولوں' کالجوں اور یونیورسٹیوں میں درس دینے سے نہیں بلکہ ہر علاقے اور ہر مقامی زبان کے ساتھ لسانی اختلاف کے جائزے کے بعد کرنا ہوگا۔اور ظاہر ہے کہ جب تک ماہرین لسانیات اس کام کو اپنے ہاتھ میں نہیں لیتے اور حکومت ایسے ادارے یا یونیورسٹیوں میں ایسے شعبے نہیں کھولتی جن میں ادب کے ساتھ زبان کے باہمی رشتے کو سمجھنے اور اس کے مطابق درس و تدریس کے لئے نصاب میں ضروری ترمیم و تنسیخ نہ کی جائے ہمارے مطلوبہ تدریسی نتائج پایہ تکمیل کو نہیں پہنچتے۔

مادری زبان کے اساتذہ بالعموم یہ سمجھتے ہیں کہ مادری زبان چونکہ طلباء کی اپنی زبان ہے لہٰذا وہ کسی مضمون کا مفہوم خود سمجھتے ہیں اور کس درجہ کس کی تفہیم ہے' اس کو جانچنے کی ہمارے یہاں کبھی کوشش نہیں کی جاتی۔کسی عبارت کو پڑھ لینا اور بات ہے اور اس میں جو حالات ہیں ان کی گہرائی تک پہنچنا اور بات ہے۔

اردو کی حیثیت اور زبانوں سے مختلف ہے۔یہ نظم و نسق کی بھی زبان ہے اور کاروباری زبان بھی اور دوسرے علاقوں سے رابطہ کی زبان بھی' لہٰذا یہاں کم و بیش ایک شخص کو دو زبانوں کا جاننا ضروری ہے۔اس کے تمام قواعد و اصول کو مدنظر رکھ کر اردو کو ترقی دینی ہوگی۔اور دیکھنا یہ ہوگا کہ دو زبانوں میں ایک شخص یکساں طور پر قدرت حاصل کرے یعنی جسے انگریزی میں bilingual کہتے ہیں۔

اس سلسلے میں درسی کتابوں کے انتخاب کا مسئلہ آتا ہے۔ یہ کتابیں ضرورت' دلچسپی اور طلباء کی ذہنی پختگی اور معیار کا خیال رکھے بغیر منتخب کی جاتی ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی کتاب کسی بڑے درجے کے لئے جن کی مادری زبان اردو نہیں' اور وہی کتاب مادری زبان کے بچوں کے لئے نیچے کے درجے میں رکھی گئی ہے' اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس سے بچوں کی نفسیات پر خراب اثر پڑتا ہے اور ان میں احساس کمتری یا برتری پیدا ہونے کا احتمال ہوتا ہے۔ مادری زبان کے لئے بچوں کے معیار اور دلچسپی کے لحاظ سے کتابیں رکھی جاتی ہیں مگر اس کے لئے objective evaluation کے بغیر بسا اوقات مصنف یا مولف کی ذاتی پسند و نا پسند پر اس کا انحصار ہوتا ہے' بیشتر قواعد کی کتابوں کا بھی یہی حال ہے۔ ایک ہی قواعد عموماً مختلف درجوں کے لئے رکھی جاتی ہیں اور اس کا لحاظ مشکل ہی سے کیا جاتا ہے کہ ادب کے طلباء کے لئے یہ قواعد اور جو لوگ زبان اور اس کی ساخت اور صوتی نظام اور صرفی ونحوی تراکیب جاننا چاہتے ہیں ان کے لئے کس قسم کی قواعد درکار ہے اور ایک خاص مدت میں' زبان میں جو تغیرات رونما ہوئے ان کا گرامر سے کیا تعلق ہے مثلاً معنی میں تبدیلی الفاظ کی اشکال میں تبدیلی اور تبدیلیوں کا زبان کے اصول وقواعد سے کیا تعلق ہے' مثلاً لڑکا آیا' لڑکے آئے' لڑکیاں آئیں' لڑکیاں آئی ہیں' اگر کسی غیر ملکی کو صرف یہ کہہ دیا جائے کہ اہل زبان اسی طرح بولتے ہیں یا مولوی عبدالحق کی قواعد اردو میں اسی طرح لکھا ہوا ہے تو آج کی سائنسی دنیا میں اس کو تسلیم کرنے میں قباحت ہوگی۔ بے قاعدگی کہیں ہے تو اس کا جواز ہے کہ ہماری زبان میں یہ بے قاعدگیاں تسلیم کر لی گئی ہیں یعنی اس بے قاعدگی میں بھی ایک بڑا قاعدہ ہے۔ کیونکہ جب افعال کی دو صورتیں آ گئیں تو پھر " آئیں" اور ہیں' دونوں کا آنا جمع کی صورت میں ضروری نہیں رہا' یہ لسانی اور صوتی مسائل ہیں مگر ہماری قواعد کی کتابیں بھی خاموش ہیں۔ بات یہ ہے کہ ہم نے قواعد کے اصول جو پرانے بنائے بیٹھے ہیں ان کو من وعن مان لیتے اور اساتذہ اور بزرگوں کی برتری اور علمی صلاحیت میں کسی قسم کی تحریف کیسے کریں' حالانکہ یہ سمجھنا چاہئے کہ زبان کا زندہ رہنا اور مرنا طبعی حقیقت ہے اور جس طرح سے زندگی کے اور شعبے میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ مثلاً لباس کی وضع قطع اور فیشن میں تبدیلیاں آتی ہیں' زبان میں بھی اس طرح سے تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں یہ اور بات ہے کہ یہ تبدیلی غیر محسوس طریقے سے اور ایک لمبے عرصے میں رونما ہوتی ہے اور فیشن' موسم کی طرح بدلتا رہتا ہے' مثلاً میر امن نے باغ و بہار میں جدا کے لئے جدی کی صورت بھی برتی ہے مگر یہ کب متروک ہوا یہ بتانا مشکل ہے' یہ بھی حقیقت ہے کہ آج کوئی جدی لکھے یا بولے تو وہ گرامر کی بے قاعدگی ہوگی بلکہ زبان کی مضحکہ خیز صورت'

اچھی لڑکی' اچھا لڑکا' اچھے لڑکے' مگر اچھی لڑکیاں' اسے ہم بے قاعدگی کہیں گے یا زبان کا قاعدہ۔ مگر یہ کیوں اور کیسے ہوا؟ اس کا جائزہ تاریخی اعتبار سے تو لیا جاسکتا ہے مثلاً میر اور سودا کے زمانے میں سوں یا تلک مروج تھا اب متروک ہے بس اس قدر' لیکن زبان کے اصول اور قواعد کا لسانی جائزہ اگر لینا ہے تو اس کا جواز پیش کرنا ہوگا۔ ان دو چار بے قاعدگیوں کے قاعدوں کی نشاندہی سے ہمارا صرف یہ مطلب ہے کہ ایک جماعت اہل زبان ماہر لسانیات' مصنفین اور ادیبوں اور اہل قلم کی ایسی ہو جو برابر اس کا جائزہ لیتی رہے کہ یہ بے قاعدگی قابل قبول ہے اور یہ متروک۔ مثلاً شان الحق حقی صاحب نے عرصہ ہوا اپنی کتاب نکتۂ راز میں ایک بڑا غور طلب مضمون لکھا ہے جس کا عنوان ہے اردو الفاظ میں ''چھوت چھات'' اس میں انہوں نے انگریزی کی صوتی بے قاعدگیوں کو بتا کر اردو کی ان چند بے قاعدگیوں کو قاعدے سے ہم آہنگ کرنے کا مفید مشورہ دیا تھا کیونکہ زبان کو اگر آگے بڑھنا ہے اور متحرک اور فعال صورت اختیار کرنی ہے تو ان کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کیونکہ امتداد زمانہ اور اصول کی بدلتی ہوئی فضا کے ساتھ ان کو دوسری سماجی اور ثقافتی تبدیلیوں کی طرح قبول کرنا ہوگا۔ میری ان سے اس موضوع پر مفصل گفتگو ہوئی ہے' میں بھی ان کا ہم خیال ہوں مگر میں یہ کہتا رہا کہ اس کا کوئی معیار Norm ہونا چاہئے۔ مگر روز بروز کی جگہ ہم ''دن بدن'' اور سالہا سال کی جگہ ''برسہا برس'' تو اب لکھنے لگے ہیں مگر بعض تراکیب کو ہم گنگا جمنی ترکیب کیوں قرار دیں اور کون اس کا فیصلہ کرے گا۔ قبول عامہ کی دلیل اپنی جگہ ہے مگر اہل قلم ہی تو عوام کے ذوق اور ان کی علمی سوجھ بوجھ کی پہچان کریں گے۔ انہوں نے بھی اس بات پر زور دیا ہے کہ وقتاً فوقتاً ان تبدیلیوں کا جائزہ لینے کیلئے اہل علم کی ایک کمیٹی ایسی ہو جو ہماری رہنمائی کرتی رہے۔ ورنہ دبستان لکھنؤ اور دبستان دہلی کی طرح برابر یہ جھگڑے زندہ رہیں گے کہ بلبل مذکر ہے یا مونث اور سوچ کر یہ کہنا پڑے گا کہ دونوں صحیح ہیں کیونکہ فیروز اللغات میں مذکر و مونث دونوں لکھا ہے۔ عموماً زبان و ادب کا باہمی رشتہ ناخن اور گوشت جیسا ہے۔ ایک سے دوسرے کو الگ نہیں کر سکتے۔ بلکہ بعض لحاظ سے زبان کو ادب پر اس لئے فوقیت ہے کہ بغیر زبان کے ادب کی تخلیق ممکن نہیں۔ مگر زبان ادب کی محتاج نہیں۔ جیسے شباب کا تصور طفلی کے بغیر ممکن نہیں مگر بچپن کا زمانہ' عہد شباب کے بغیر احاطۂ تصور میں آسکتا ہے یہ اور بات ہے کہ دونوں کے دو مختلف ادوار ہیں مگر عہد طفلی' عنوان شباب' اور شباب کے ادوار ایک دوسرے سے اس طرح پیوستہ ہیں کہ ان کے ارتقاء کی مختلف منزلوں کے بغیر ایک مکمل آدمی کا تصور نا ممکن ہوگا۔

ہمارے ہاں تدریسی نظام کا ایک بڑا نقص یہ بھی ہے کہ ٹریننگ کالجوں میں اور مضامین کے اساتذہ کی

تو با قاعدہ ٹریننگ ہوتی ہے مگر زبان پڑھانے کیلئے یہ ضروری سمجھا جاتا ہے کہ وہ اگر اس زبان کا بولنے والا ہے تو یہ کافی ہے کہ وہ پڑھالے گا۔ حالانکہ سب سے زیادہ مشکل اپنی ہی زبان کا پڑھانا ہے۔ مختلف طلباء کی صلاحیت مختلف ہوتی ہے اور دوسرے مضمون میں کم و بیش سب کی صلاحیت برابر کی ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ زبان کے معاملے میں اوپر کی سطح پر یہ کمزوری زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے جب اسلوب، طرز اور انشا کی بات ہوتی ہے۔

اس سلسلے میں ترجمے اور وضع اصطلاحات کا مسئلہ بھی قابل توجہ ہے چونکہ اردو کو ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے رائج کرنے کا سوال اب بھی زندہ ہے۔ مختلف مضامین کی کتابیں ترجمے کی شکل میں بازار میں آرہی ہیں مگر اصطلاحات میں ہمواری اور یکسانی نہیں اس سے بھی زبان کو نقصان پہنچ رہا ہے اور ظاہر ہے تدریس کے کام میں بھی رکاوٹ پیدا ہو رہی ہے مثلاً آدھا تیتر آدھا بٹیر کی طرح بعض جگہ انگریزی کی اصطلاحیں مستعمل ہیں اور کہیں غیر مانوس عربی کی۔ جس سے زبان بوجھل اور ناہموار ہوتی جارہی ہے۔

اردو زبان میں حیرت انگیز طور پر لچک ہے اور خاص کر اس کا صوتی نظام ایسا ہے کہ مستعار الفاظ کو بھی اپنے صوتی نظام میں اس طرح ڈھال لیا ہے کہ آج یہ اسی زبان کے الفاظ معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً بوتل، بوتام، گودام وغیرہ۔ ان کے جمع کے قاعدے بھی ویسے ہی ہیں جیسے اردو کے اور بنیادی الفاظ ہیں۔ انگریزی کے مشہور شاعر اور ناول نگار رابرٹ گریوز نے ترجمے کو جھوٹ کہا ہے اور کہتا ہے کہ یہ ناممکن ہے کیونکہ صحیح ترجمے میں حسن بیان کا خیال رکھیے تو عبارت اصلیت سے دور ہو جاتی ہے۔ ایک ایسا زمانہ بھی تھا جبکہ فرانس کے ایک ادیب Etienne Dolet (۱۵۰۹۔۱۵۴۶) کو گلا گھونٹ کر اس لئے مار ڈالا گیا تھا اور اس کی تمام تحریروں کو نذر آتش کر دیا گیا تھا کیونکہ لوگوں کا یہ خیال تھا کہ اس نے افلاطون کی تصنیفات کا ترجمہ اصل کے مطابق نہیں کیا تھا۔

آج وہ زمانہ تو نہیں مگر ایسی مثالیں تو ملتی ہیں کہ شاعری کا ترجمہ تو ہو گیا مگر اس کی روح جسد شاعری سے پرواز کر گئی۔ ہر زبان کا اپنا کلچر ہوتا ہے اردو زبان کو اس کے لطیف اشارے کنایے اور بلیغ استعارے سے الگ کر دیجئے تو کیا رہ جاتا ہے۔ کیا غالب کے اس شعر کا ترجمہ ممکن ہے۔

تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہ کن اسد　　　　سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

یا "قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا" غالب کا پورا دیوان ہندی زبان میں ترجمے کی شکل میں منتقل ہو گیا ہے مگر غالب کی روح پر جو گذر رہی ہوگی اس کا حال کس کو معلوم ہے۔

ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر شو بھا   وہ سمجھتے ہیں کہ روگی کی دشا ہے اُتّم

اس ساری گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ ترجمے میں (Stan dardization) کی ضرورت ہے تاکہ اصل روح باقی اور زبان کا لطف دوسری زبان میں برقرار رہے۔

اگرچہ سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر برابر تجویزیں پیش کی جارہی ہیں کہ اردو زبان کو سرکاری زبان کو دفتری زبان کی حیثیت سے ترقی دے کر اس کو وسعت دی جائے مگر عملی طور پر دیکھا جائے تو اس باب میں بہت کم کام ہوا ہے اور تک ہم یہی فیصلہ نہیں کر سکے کہ پاکستان میں اردو کا صحیح مقام ہے کیا؟ اور علاقائی زبانوں کو کیا درجہ دیا جائے گا اور ان میں اور اردو زبان میں کس قسم کے رابطے اور اشتراک اور ہم آہنگی کی ضرورت ہے۔ اس کام کے لئے ضروری ہے کہ تمام علاقائی زبانوں کا باضابطہ سروے کر کے اردو میں ان کی قواعد مرتب کی جائے۔ لسانی تجزیہ کر کے دیکھا جائے کہ کس طرح ان کو اردو سے قریب لایا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے یہ کام چند افراد کا نہیں بلکہ مختلف اداروں کا ہے جن میں باہمی اشتراک کے ساتھ ساتھ سرکاری سرپرستی اور مالی امداد کی ضرورت ہوگی۔ ورنہ اردو کی جگہ انگریزی رابطے کی زبان رہے گی اور نہ دوسری علاقائی زبانوں کی خاطر خواہ ترقی ہوگی نہ اردو پاکستان کی سرکاری زبان بنے گی اور پاکستان میں زبان کا مسئلہ ویسے ہی عقدۂ لاینحل بنا رہے گا۔

ایران کے ایک ممتاز زبان دان اور محقق ڈاکٹر محمد حسین تسبیحی جو ایک عرصہ دراز سے پاکستان میں مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان سے منسلک رہے ہیں اپنے ایک مقالے میں لکھتے ہیں کہ "میں پاکستان میں اردو زبان کے مطالعہ اور دانشوروں اور زبان شناسوں سے سوالات و جوابات کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اردو زبان کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (۱) ادبی اردوؔ (۲) عمومی اردوؔ (۳) اخباری اردوؔ (۴) دینی اردوؔ (۵) علمی اردو۔

سید محمد مہدی ☆

شاہ نامۂ فردوسی کے دو منظوم ترجمے

اس وقت میرے سامنے شاہ نامۂ فردوسی کے دو منظوم ترجمے ہیں۔ ایک اردو میں اور ایک انگریزی میں۔ یہ دونوں اگر نایاب نہیں تو کم یاب تو یقیناً ہیں۔ پہلے انگریزی ترجمے کا کچھ ذکر ہو جائے۔

انگریزی مترجم ہیں الگزنڈر راجرس۔ وہ اس سے قبل جامی کی ''یوسف زلیخا'' کا بھی ترجمہ کر چکے تھے۔ بوستانِ سعدی کو ایڈیٹ کر چکے تھے۔ لندن کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے رکن ہونے کے علاوہ وہ بمبئی کی کونسل کے رکن بھی رہ چکے تھے۔ دیباچے میں ان کے متعلق یہ اطلاع ملتی ہے کہ وہ ساٹھ سال سے فارسی کے مطالعے میں مصروف ہیں اور ہندوستان کے قیام کے دوران انہوں نے مشرقی علوم پر بہت کام کیا لیکن شاہ نامہ کا ترجمہ ان کا سب سے گراں مایہ کام ہے۔ یہ ترجمہ لندن سے ۱۹۰۷ء میں شائع ہوا۔ لیکن یہ اشاعت بہت محدود تھی یعنی یہ غالباً صرف ان کیلئے تھی جو اس کی اشاعت سے پہلے اس کے خریدار بن چکے تھے۔ کتاب کے آخری صفحہ پر ان خریداروں کی پوری فہرست شائع ہوئی ہے مثلاً پارسی پنچایت کے متولیوں کے لئے پچاس جلدیں، حکومت بمبئی کے لئے تیس جلدیں۔ اس کے بعد بمبئی کے سربرآوردہ پارسیوں کے نام ہیں جن میں سے کسی نے زیادہ کسی نے کم اور کسی نے ایک جلد کی خریداری منظور کی۔ لیکن جس نام نے مجھے چونکا دیا وہ تھا ''موہن داس کرم چند گاندھی --- ایک جلد جنوبی افریقہ'' کیا یہ جلد جو میرے ہاتھ میں ہے یہ کبھی گاندھی جی کے زیر مطالعہ رہی ہوگی؟ ممکن ہے! بہت ممکن ہے۔ دہلی کے قرول باغ کے فٹ پاتھ پر پڑی ہوئی کتاب میں الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ کاغذ ایسا خستہ کہ ہاتھ لگانے سے ٹوٹ جائے۔ کاغذ کا رنگ بالکل پیلا پڑ چکا ہے۔ کتاب میں جابجا پنسل سے نشان بنائے گئے ہیں اور حاشیوں پر بھی نوٹ ہیں۔

خط سے اندازہ ہوا کہ گاندھی جی کی کتاب نہیں ہو سکتی۔ ان کا خط بہت خراب تھا لیکن کیا یہ اس حیرت ناک انسان کی شخصیت کے ایک اور پہلو کو ہمارے سامنے پیش نہیں کرتی جو اپنی تمام مصروفیات کے

☆ فاضل مصنف کا تعلق یوپی کے ایک ممتاز علمی گھرانے سے ہے بلند پایہ فنکار ہیں اور بالخصوص اپنے ڈراموں کیلئے بین الاقوامی شہرت رکھتے ہیں آپ کا ایک ڈرامہ ایڈنبرا یونیورسٹی میں سٹیج کیا گیا جبکہ ماسکو کے تھیٹرز میں تسلسل سے آپ کے ڈرامے سٹیج کیے گئے ہیں۔ آجکل آپ جامعہ ملیہ دہلی (انڈیا) سے وابستہ ہیں ہم ممنون ہیں کہ ہمیں آئندہ بھی آپ کے قلمی تعاون کی توقع ہے (ادارہ)

باوجود ایشیا کی ایک عظیم الشان تہذیب سے واقفیت حاصل کرنا اور دنیا کی ایک بہت بڑی رزمیہ نظم سے لطف اندوز ہونا ضروری سمجھتا ہو۔ معلوم نہیں سابرمتی آشرم میں یا گاندھی میوزیم میں شاہنامے کی وہ جلد محفوظ ہے کہ نہیں جو گاندھی جی نے جنوبی افریقہ کے قیام کے دوران منگائی تھی یا یہ جلد جو میرے ہاتھ میں ہے کبھی گاندھی جی کی ملکیت تھی؟

ایسا لگتا ہے کہ بمبئی اور لندن میں مقیم کچھ سربرآوردہ پارسیوں نے اس ترجمے کی اشاعت میں مترجم کی مدد کی۔ کتاب کا انتساب اس پر کچھ روشنی ڈالتا ہے۔ یہ انتساب ایک خط کی شکل میں ہے جو الگزینڈر راجرس نے سر منوچہر جی مروان جی بھاؤنگری کے نام لکھا ہے۔ اس میں انہوں نے شکریہ ادا کیا ہے کہ آپ کے وطن کے عظیم رزمیہ کے ترجمے میں آپ نے میری بہت مدد کی آپ کو یہ حوصلہ اپنے مرحوم والد سے ورثے میں ملا ہے جنہوں نے ساری زندگی فارسی ادب کی خدمت میں گزار دی۔ اسی لئے یہ ترجمہ منوچہر جی کے والد مروان جی نوشیرواں جی بھاؤنگری کے نام معنون کیا گیا ہے۔

پورا ترجمہ منظوم نہیں ہے لیکن یہ دعویٰ ضرور کیا گیا ہے کہ اتنے بڑے حصے کا منظوم ترجمہ انگریزی زبان میں زیر نظر کتاب کی اشاعت تک کسی نے نہیں کیا تھا۔ بہت سے حصوں کو مختصر طور پر نثر میں بیان کر کے اہم حصوں کا منظوم ترجمہ کیا گیا ہے۔ مثلاً رستم اور تہمینہ کی ملاقات، سہراب کی پیدائش وغیرہ کے واقعات مختصراً نثر میں ہیں اور رستم اور سہراب کی جنگ اور رستم کے ہاتھوں سہراب کا قتل یہ سب منظوم ہے۔ ترجمے کو مثنوی کے فارم سے قریب تر لانے کے لئے مناسب بحر استعمال کی گئی ہے اور ہر دو لائنوں میں قافیے کا التزام رکھا گیا ہے۔ معلوم نہیں یہ ترجمہ دوبارہ شائع ہوا یا نہیں۔

اول تو شاعری کا ترجمہ تقریباً ناممکن ہے اور پھر مشرقی زبان سے مغربی زبان میں یا مغربی زبان سے کسی مشرقی زبان میں ترجمہ تو بالکل ناممکن ہے۔ اگر فٹز جیرلڈ عمر خیام کی رباعیاں ترجمہ کرنے میں کامیاب ہوا تو وجہ یہ ہے کہ وہ ترجمہ نہیں بلکہ تخلیق ہے۔ شاہنامہ کا زیر نظر ترجمہ بھی شاعرانہ حیثیت سے کوئی بڑی چیز نہیں لیکن اس معنی میں قابل ستائش ہے کہ شاہنامہ کی روح برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے اور انگریزی داں کو پورے شاہنامہ سے واقفیت حاصل ہو جاتی ہے۔ اردو ترجمہ

شاہنامے کے جس اردو ترجمے کا میں ذکر کر رہا ہوں اس کی جو جلد میرے پاس ہے وہ بدقسمتی سے کرم خوردہ بھی ہے اور اس کے اخیر کے کچھ صفحات غائب بھی ہیں۔ سرورق پر کتاب کا نام ہے ''شاہنامہ اردو

معہ تصاویر: ۱۲۷۷ھ" جن صاحب نے یہ ترجمہ کیا ہے وہ اتنے منکسر مزاج ہیں کہ اپنا نام صرف منشی لکھا ہے اور بس۔

منشی نے اس کتاب کا سبب تالیف یوں بتایا ہے:

توکل کہ مرد سخن سنج تھا — کیا ترجمہ اس نے شنامے کا
لکھا نثر میں نسخۂ مختصر — کہ احوال معلوم ہو سر بسر
یہ شمشیر خانی وہ موسوم ہے — تمام اس میں احوال مرقوم ہے

ایک شب دوستوں کی محفل میں شعر و شاعری کا ذکر تھا کہ کسی نے توکل کے ترجمے کا تذکرہ کیا:

یہ سن کر برادر مرے مہرباں — سخن فہم و دانشور و نکتہ داں
یہ بولے کہ اے منشی اس نالے کو — تم اب ریختہ کی زباں میں لکھو
کرو نظم ترتیب با آب و تاب — بنام شہنشاہ گردوں جناب
خدا نے جسے شاہ اکبر کیا — خداوند اورنگ و افسر کیا
مرتب یہ شنامہ جب ہو چکا — کیا فکر جب سال تاریخ کا
تو پھر ہاتف غیب نے صبحدم — کہا قصہ خسروان عجم

۱۲۲۰ھ

یعنی یہ کتاب ۱۲۲۰ھ مطابق ۱۸۰۵ء میں مکمل ہوئی لیکن شائع ہوئی پچپن برس بعد یعنی ۱۲۷۷ھ مطابق ۱۸۶۰ء میں۔ معلوم نہیں کتاب منشی کی حیات میں شائع ہوئی یا بعد میں لیکن اتنا تو وثوق سے کہا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب اکبر شاہ کی زندگی میں شائع نہیں ہوئی جن کا انتقال ۱۸۳۷ء میں ہوا اور جن کی مدح میں منشی نے بہت سے شعر کہے تھے۔

کتاب کی ابتدا حمد سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد نعت ہے اور پھر شاہ اکبر کی مدح میں اشعار ہیں اور سبب تالیف کے بعد شاہ نامہ کے قصوں کی ابتدا ہو جاتی ہے۔ واقعات کے تمام عنوان فارسی میں ہیں۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے یہ شاہ نامہ کا مکمل ترجمہ نہیں ہے بلکہ بنیاداً اس کی ایک نثری ترجمہ ہے جو شاہ نامہ کی تلخیص ہے۔ لیکن ترجمے سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ مترجم نے اول تو اصل مثنوی کی بحر ہی میں ترجمہ کیا ہے اور دوسرے ترجمے میں فارسی کا رنگ پیدا کرنے کی کہیں کہیں کوشش کی ہے مثلاً دوسری لڑائی سے پہلے

سہراب رستم سے مخاطب ہوتا ہے:

تہمتن سے پہلے ہوا صبح کو   کہا دو ہیں ہنس کر کہ اے تند خو
مصمم کیا تو نے اب دل میں کیا   ارادہ لڑائی کا یا صلح کا
بہم محفل آرا و مے نوش ہوں   بہ چنگ و نے و مے طرب کوش ہوں
تو شاید کہ ہے زال زر کا پسر   یل پیل تن رستم نامور

ظاہر ہے یہ توقع تو کی نہیں جا سکتی کہ فردوسی کا رنگ اردو میں آ جائے لیکن یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ منشی کی زبان اور اسٹائل میں روانی ہے۔ ظاہر ہے یہ ترجمہ نہیں ہے لیکن اصل کو سامنے رکھ کر اس سے قریب تر ہونے کی کوشش کی گئی ہے۔ جب رستم پہلی بار افراسیاب کی بیٹی منیژہ سے ملتا ہے تو:

سر رحم سے پھر تہمتن وہیں   یہ بولا کہ زیر سپہر بریں
پڑا تجھ پہ یک بارگی کیا غضب   ہوئی جو گرفتار رنج و تعب
بیاں کر کہ تو کون ہے کیا ہے نام   ہوا زرد کیوں عارض لالہ فام
منیژہ لگی کہنے کر کے فغاں   کروں حال اپنا کیا اب بیاں
منیژہ ہوں میں دخت افراسیاب   کیا گردش آسماں نے خراب
محبت سے بیژن کی اے نامور   پڑی افسر و تخت سے دور تر

ظاہر ہے اصل فارسی مثنوی بھی منشی کے پیش نظر رہی ہوگی کیونکہ آخری دو شعر میں اصل سے ترجمے کی کوشش کی گئی ہے۔ اصل یوں ہے:

منیژہ منم دخت افراسیاب   برہنہ ندیدہ تنم آفتاب
برائے یکے بیژن شور بخت   فتادم ز تاج و فتادم ز تخت

اگر اردو کا کوئی ادارہ اس کتاب کو دوبارہ شائع کر سکے تو اردو پڑھنے والوں کی واقفیت شاہنامۂ فردوسی سے کچھ بڑھ جائے گی اور ہم ایک اچھی اور مفید کتاب کو محفوظ بھی کر سکیں گے۔

ڈاکٹر عالیہ امام

میرؔ مثنویات کے آئینے میں

ایک امریکن نقاد Malcolm Cowley نے اپنے ایک مضمون 'شاعر اور فن کار' کے سلسلہ میں ایک مقام پر بڑے مزے کی بات کہی ہے کہ شاعر کو دنیا نے ہمیشہ غلط سمجھا ہے۔ کاؤلی کا اپنا ذاتی خیال ہے کہ فن کی عظمت کی خاطر شاعر کو شعوری طور پر کوشش کرنا چاہئے کہ وہ زمانہ کی غلط فہمیوں کا شکار رہے۔ اردو ادب میں کم از کم میرؔ اس گروہ کے سرخیل ہیں۔ ان کے ساتھ زمانہ اب تک انصاف نہیں کر سکا۔ وہ ان مظلوم فنکاروں میں ہیں جن کی افسردگی ناقدین کی دین ہے۔ یہ کہنا تو مشکل ہے کہ انہوں نے شعوری طور پر اپنے کو غلط رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ لیکن یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ لوگوں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر ان کو غلط سمجھا اور دنیا کے سامنے غلط طریقہ پر پیش کیا۔ ان کی عظمت مسلم مگر عظمت کی بنیاد محض دل کی بربادی نہیں بلکہ آبادی پر بھی ہے۔ میرؔ خود اس حقیقت سے آگاہ تھے اور اس کی حفاظت کرنا چاہتے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ یہ نہ کہتے ؎

دل وہ نگر نہیں جو پھر آباد ہو سکے   پچھتاؤگے سنو ہو نہ اس کو اجاڑ کے

اس شعر میں زندگی کے مثبت و منفی دونوں پہلوؤں کی ترجمانی ملتی ہے لیکن زور مثبت پہلو پر ہے۔

غزل داخلی کیفیت کی ترجمانی تو ہو سکتی ہے مگر وہ پوری شخصیت کی عکاس نہیں ہو سکتی۔ لوگوں نے زیادہ تر میرؔ کی غزل کا مطالعہ کیا ہے۔ دوسرے اصناف سخن کی طرف توجہ کم دی ہے۔ اس چیز کا نتیجہ یہ بندھا بندھایا اور تراشا تراشایا نظریہ ہے کہ میرؔ فطرتاً محزون مزاج اور الم پرست تھے۔ میرؔ کے ہر ناظر کو میرؔ کے کلام پر حزن و یاس کا سایہ لہراتا ہوا نظر آتا ہے۔ مگر ان کی شخصیت غزل کی طرح تہہ در تہہ اور دوسری نثری تخلیقات بھی مفید ہو سکتی ہیں اور غزل کے علاوہ دیگر اصناف سخن بھی۔ یہ بھی ایک عجیب و غریب حقیقت ہے جسے زمانہ کی ستم ظریفی کے لئے میرؔ کے بارے میں مولوی محمد حسین آزادؔ کے وقت سے بازار میں جو سکہ رواں ہے وہ آج تک چل رہا ہے۔ ان کے دل پر خون کی گلابی نے اتنی شہرت پائی کہ لوگوں کی نظروں سے ان کے شرابی رہنے کی کیفیت چھپ گئی۔ سب نے انہیں روتے ہوئے دیکھا مگر ہنستے ہوئے انہیں کم لوگ دیکھ سکے۔ ان کے فن کا سب سے بڑا معجزہ یہی ہے کہ وہ خارجی پیکر میں داخلیت کی روح کچھ اس طرح پھونک دیتے ہیں کہ ہر شخص اس میں اپنے دل کی دھڑکن سن سکتا ہے۔ کوئی بھی فن پارہ نہ تو بغیر خارجی عوامل کے ترتیب پا سکتا

ہے اور نہ اس میں زندگی کی روح پھونکی جاسکتی ہے۔ فن کار کی آنکھ کھلی ہوتی ہے اور دل بھی۔ داخلیت اور خارجیت کا یکی حسین اور متوازن امتزاج میرؔ کے فن کی بلندی ہے۔ میرؔ کی عظمت محض ان کی دروں بینی پر نہیں بلکہ ان کی بروں بینی پر ہے۔ ان کے کلام میں اس کی داخلی شہادتیں موجود ہیں۔ اگر وہ صرف دروں بین ہوتے تو یک ضیع بن کر رہ جاتے مگر ہمیں ان کے دیوان میں مرثیہ، رباعی، قطعہ، مخمس، مربع، مثلث، ترکیب بند، ترجیع بند، قصیدہ اور مثنوی سب ملتا ہے۔ ان اصناف سخن کے مطالعہ کے بعد ہی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اگر غزل کی دنیا میں میرؔ اندر کی طرف جھانکتے ہیں تو دوسرے اصناف سخن میں باہر کی طرف۔ یہ بات سب سے زیادہ ہمیں ان کی مثنویوں میں دکھائی دیتی ہے۔ یہ وہ دریچہ ہے جسے کھول کر وہ نہ صرف اپنے سماج بلکہ پوری دنیا کو دیکھتے ہیں اور دوسروں کو بھی دیکھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ان کی مثنویوں کی فہرست بہت طویل نہیں پھر بھی ان کی تعداد متعدبہ ہے۔ چھوٹی بڑی مثنویوں کو ملا کر کل تعداد کم و بیش تیس (۳۰) بتیس (۳۲) کے قریب ہوتی ہے۔ یہ مثنویاں مختلف عنوانات کے تحت ہیں۔ ان میں سے کچھ کا تعلق میرؔ کی ذاتی زندگی سے ہے جن کا مطالعہ میرؔ کی شخصیت کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔ مثلاً مثنوی در ہجو خانہ خود۔ شکایت برشگال۔ مثنوی خواب وخیال وغیرہ۔ یہ مثنویاں ایسی ہیں کہ جن سے میرؔ کی محزون مزاجی کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ میرؔ کی محزون مزاجی فطری نہ تھی بلکہ حالات کی پروردہ۔ اکثر یہ محزون مزاجی جب طنز وتعریض کا روپ اختیار کرتی ہے تو اکثر اوقات تنگ مزاجی اور بددماغی کی سرحدوں کو چھو لیتی ہے۔ حقیقتاً میرؔ کا رونا بھی سماج پر طنز ہے۔

میرے رونے کی حکایت جس میں تھی — ایک مدت تک وہ کاغذ نم رہا

میرؔ کے زمانہ میں جو انتشار اور مزاج تھا۔ اس کی بوسیدگی 'کاغذ نم' سے زیادہ اور کیا ہو سکتی تھی۔ اس نمی کے اثرات ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد تک قائم رہے۔ اہل حرفہ تباہ حال تھے۔ شرفاء پریشان۔ بادشاہ وقت شاہ شطرنج۔ فن کار کی قدر اس دور میں کیا ہوگی۔ میرؔ کا گھر ہو بہو افتراع سلطنت کا نقشہ ہے۔

مٹی اس کی کہیں کہیں بھکی	جی ڈبا اور چھاتی بھی ڈبکی
سان کر خاک لگ گئے دو چار	بارے جلدی درست کی دیوار
اچھے ہوں گے کھنڈر بھی اس گھر سے	برسے ہے یک خرابی گھر در سے
ایک شہرہ ہے شہر دلّی کا	جیسے روضہ ہو شیخ چلّی کا
بانس کی جاوے ہیں سرکنڈے	وہ بھی سیہوں میں سب موے ٹھنڈے
کل کے بندھن ہوئے ہیں ڈھیلے سب	پا کھے رہنے لگے ہیں گیلے سب

شیخ چلّی کا روضہ، پاکھوں کا گیلا رہنا، گھر والے خرابی کا برسنا، مٹّی کا کہیں کہیں بہکنا، دو چار روپے رکھ کر دیوار کا جلدی جلدی درست کرنا۔ یہ تمام وہ باتیں ہیں جو حقیقت بھی ہو سکتی ہیں اور استعارہ بھی۔ اگر یہ سب حقیقتیں ہیں تو میرؔ کے ایسے شریف و نجیب انسان کے زبوں حالی کا ماتم جو خاندانی شرافت و نجابت کے علاوہ ایک 'فن شریف' کا، لک بھی تھا اور اگر استعارہ ہے تو سماجی انتشار اور سراسیمگی کا نوحہ۔ ان حالات میں اگر میرؔ کا غرور فن تکبر کی حدوں سے گزر کر جنون تک پہنچ جائے تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے۔ دیوانگی زندگی سے گریز نہیں بلکہ ناموافق حالات سے لڑنے کا عزم ہے۔ سر شاہ سلیمان مرتب مثنویات میرؔ کے خیال میں میرؔ کا جنون موروثی ہے مگر ان کی مثنوی خواب و خیال کو پڑھ کر ایسا نہیں معلوم ہوتا بلکہ ناموافق حالات کا منطقی نتیجہ، بلوغ کی منزل پر پہنچنے سے پہلے وطن کا چھوڑنا، بھائیوں کی طوطا چشمی، احباب کی بے مروتی، اپنی بے سرو سامانی۔ ان تکلیف دہ حالات میں میرؔ کے پاس سوائے سرمایۂ دل کے اور کیا باقی تھا۔ یہی ایک شیشہ تھا جسے وہ ہر پتھر سے ٹکرا رہے تھے۔ دلّی پہنچ کر بھی سکون ان کی قسمت میں نہ تھا۔ غالباً دلّی کی وہی تعریف انھوں نے اکبر آباد میں سنی ہوگی جس کا اظہار انھوں نے لکھنؤ آ کر اپنے مشہور و معروف قطعہ میں 'تھا' کے ساتھ کیا ہے۔ حال اور ماضی کا یہ فرق ممکن اور موجود کا فرق تھا۔ امید اور ناامیدی کی کشمکش۔

دلّی کہ ایک شہر ہے عالم میں انتخاب　　　رہتے ہیں منتخب ہی وہاں روزگار کے

مگر اس جنت ارضی میں پہنچ کر میرؔ پر کیا گزری، اس کا ذکر میرؔ ہی کے زبان سے سنئے۔

پس از قطع رہ لائے دلّی میں بخت　　　بہت کھینچے یاں میں نے آزار سخت
جگر جور گردوں سے خوں ہوگیا　　　مجھے رکتے رکتے جنوں ہوگیا
ہوا خبط سے مجھ کو ربط تمام　　　لگی رہنے وحشت مجھے صبح و شام
کبھو کف بلب مست رہنے لگا　　　کبھو سنگ در دست رہنے لگا

میرؔ کا کف بلب مست رہتے ہوئے بھی سنگ در دست رہنا خالی از معنی نہیں۔ آخر ایسا کیوں تھا؟ کیا اس سے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ مستی میرؔ کی فطرت تھی اور سنگ در دست ہونا سماجی حالات کا نتیجہ۔ آخر غالبؔ ایسے ظریف انسان کو بھی تو یہی کہنا پڑا کہ۔

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ　　　سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

دیوجانس کلبی باوجود اندھے ہونے کے اپنے ہاتھوں پر چراغ رکھ کر چلا کرتے تھے اور جب لوگ پوچھتے تھے تو یہی کہتے تھے۔

از دام و دو گریزم و انسانم آرزو ست

میر حالات سے تنگ آ کر تخیلی پیکر تراشتے ہیں تا کہ رومان کی فضاؤں میں گم ہو جائیں۔ رومانی دنیا کی یہ تلاش اور دوشیزہ ماہ پیکر کا تصور زندگی سے لڑنے کا عزم اور اسے سنوارنے کی خواہش تھی۔ یہ شکل اگر زمین پر نظر نہ آتی تھی تو میر اسے آسمانوں میں ڈھونڈتے تھے تا کہ وہ اس میں کھو جائیں اور زندہ رہنے کا ولولہ حاصل کریں۔ یہ حالات کے آگے سپر اندا ختگی نہ تھی بلکہ ماحول کا صحیح تجزیہ۔ گرتے ہوئے سماج کی حالت انفرادی کوششوں سے سنبھالی نہ جا سکتی تھی اور میر کے زمانہ میں کوئی ایسی عوامی تحریک موجود نہ تھی جس کا وہ ساتھ دے سکتے۔ لہٰذا میر سوائے اس کے اور کیا کرتے کہ۔

یہ وہم غلط کاریاں تک کھنچا ‏ ‏ کہ کار جنوں آسماں تک کھنچا

نظر آئی اک شکل مہتاب میں ‏ ‏ کمی آئی جس سے خور و خواب میں

جو دیکھو تو آنکھوں سے لو ہو بہے ‏ ‏ نہ دیکھو تو جی پر قیامت رہے

وہی جلوہ ہر آن کے ساتھ تھا ‏ ‏ تصور مری جان کے ساتھ تھا

اگر ہوش میں ہوں اگر بے خبر ‏ ‏ وہ صورت رہے میرے پیش نظر

اسے دیکھوں جیدھر کروں میں نگہ ‏ ‏ وہی ایک صورت ہزاروں جگہ

حقیقت اور تخیل کا یہ حسین امتزاج میر فن کی بلندی ہے۔ اسی طرح مثنوی شکایت بر شکال میر کے ایسے سیکڑوں لوگوں کی زندگی ہے۔ یہ لعنت اس دور میں بھی اسی طرح موجود ہے جس طرح میر کے زمانہ میں جبکہ آج زندگی اتنی زیادہ کشادہ، وسیع، ہمہ گیر، جمہوری اور منصوبہ بند ہے۔ آج کے معمولی حالات میں 'سفید پوشی' کا نبھانا کارے دارد سے کم نہیں۔ سامان زندگی کی افراط کے باوجود لوگ فاقوں سے مر رہے ہیں۔ نہ ان کے پاس گھر ہے، نہ گرہستی۔ برسات کا حال محلوں میں بیٹھ کر، بنگلوں میں رہ کر، قلعۂ معلّی کی چار دیواری میں بند ہو کر نہیں معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اسے کچے مکانات، جھگیاں، خیمہ بدوشوں کے ڈیرے اور ان کے سرکیوں سے بنی ہوئی پر چھتیاں بتا سکتی ہیں۔ دو سو برس سے زیادہ ہونے کو آئے مگر میر کا سکہ بازار میں آج بھی رواں ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ اگر میر کی زندگی سے قربت نہ تھی تو پھر کیا ہو سکتی ہے؟ ان کو بد دماغ کہنا بہت آسان ہے جیسا کہ مولوی محمد حسین آزاد نے کیا اور دوسرے ناقدین و مورخین نے اس کی تصدیق کی۔ مگر ان کی بد دماغی کو سمجھنا آسان نہیں اس لئے کہ ہر شخص اس

کا اک مقام سے ہے۔ میر قہقہہ تو یقیناً نہیں لگا سکتے تھے مگر احتجاج ضرور کر سکتے تھے اور بھی انہوں نے کیا بھی۔ ان کی گوشہ نشینی حالات پر طنز اور ان کا توکل ان کا احتجاج تھا۔ مگر وہ نہ تو آدم بیزار تھے اور نہ زندگی سے خفا اور مایوس۔ وہ زندگی کو ہنس کر بسر کرنا چاہتے تھے۔ حالات انہیں ہنسنے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ ان کے کلام میں زندگی سے رس نچوڑ لینے کی ایک دبی دبی سی خواہش ملتی ہے۔ میر کے اس مزاج کو سمجھنے کے لئے ان کی مثنوی ساقی نامہ ایک دعوت مطالعہ ہے۔ ساقی نامہ محض فن کی لطافت نہیں بلکہ زندگی کی فکری اساس ہے جس میں آرزو مندی اور زندگی کو طرب ناک بنانے کا حوصلہ پایا جاتا ہے۔ میر نے جگہ جگہ پر اپنا تعارف قلندر، جوگی، میر صاحب، میر جی، میر صاحب قبلہ فقیر وغیرہ سے کرایا ہے۔ اس قسم کا انسان نہ تو آسمان سے جھگڑ سکتا ہے اور نہ زمین سے پرخاش رکھ سکتا ہے۔ اور اگر جذبات سے متاثر ہو کر ایسا کر بھی جاتا ہے تو پھر متاسف ہوتا ہے کہ آخر اس طرح زندگی سے کیسے نبھے گی۔

ساقی نامہ میر کا زندہ معجزۂ فن ہے جس کی نمود خونِ جگر سے ہوتی ہے۔ یہ ان کی زندہ دلی کا ثبوت بھی ہے اور زندگی کو خوشی خوشی بسر کرنے کا اشارہ بھی۔ اس مثنوی میں ان کا سوزِ دل بھی شامل ہے اور سازِ دل بھی۔ مثنوی میں نغمہ کی جھنکار، الفاظ کا بہاؤ اور بحر کی روانی کے علاوہ ترکیبوں کی شگفتگی، خیال کی پاکیزگی، بیان کی لطافت، جذبہ کی ندرت، جمال و موسیقیت کی نکہت بار فضائیں ملتی ہیں۔ پوری مثنوی دامانِ باغبان و کفِ گلفروش معلوم ہوتی ہے۔ زمین میکدہ لالہ زار بنی ہوئی ہے۔ شراب اچھل رہی ہے۔ پیالے چھلک رہے ہیں۔ پوری فضا سرخی مے میں ڈوبی ہوئی ہے اور یہ دلکش نغمہ اس شخص کا ہے جو اپنی آہ اور بہتر نشتر، کے لئے بدنام ہے :

غنچے کی گلابیاں بھری ہیں	تکلے کی منتظر دھری ہیں
ہر نہر میں ہے شور قلقل ڈلے کا	چھلکے ہے جو اس میں رنگ مے کا
بوندوں کا جو لگ رہا ہے جھمکا	رنگ گل و لالہ زور چمکا
ہر شاخ ہے شوخ جام در دست	نرگس ہے کسو کی نرگس مست
چشمک کرے ہے حباب جو کا	یعنی کہ ہو دور اب سبو کا
ساقی قدحے کہ ذوق مل ہے	مطرب غزلے کہ فصل گل ہے
بے ساغر مے خنک ہے جینا	رکھتا ہے شگون شراب پینا

میرؔ نے شراب کی کیفیت جہاں بھی بیان کی ہے وہ شرابی کے رنگ میں ڈوب کر۔ ان کی یہ شراب ،شراب معرفت بلکہ اصلی، خالص اور دو آتشہ۔ یہ شراب محض خون جگر کی کشیدہ نہیں بلکہ بوتلوں میں بھی بند ہے۔

یا ہاتھوں ہاتھ لو مجھے مانند جام مے　　یا تھوڑی دور ساتھ چلو، میں نشہ میں ہوں
نازک مزاج آپ قیامت ہیں میرؔ جی　　جوں شیشہ میرے منہ نہ لگو، میں نشہ میں ہوں

ان اشعار کو پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک شرابی نشہ میں جھومتا ہوا چلا جا رہا ہے۔ کس کی مجال کہ اسے ٹوک دے۔ شراب نوشی نے اس کی نازک مزاجی کو اس درجہ تک پہنچا دیا ہے کہ۔
آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے۔ کم و بیش یہی حال میرؔ کے اس ساقی نامہ میں ہے۔ جہاں کہیں انہوں نے شراب کا ذکر کیا ہے خوب لطف لے کر کیا ہے۔

وہ دلبر خود سر و شر آئیں　　وہ رہزن راہ دین و تمکیں
وہ دامن خشک جس سے جل جائے　　ثابت قدموں کا پاؤں چل جائے

شراب کا یہ تصور اتنا حسین اور اس کا ذکر اتنا لطیف ہے کہ میر علی متقی کا بیٹا دل کے غبار اس سے دھونا چاہتا ہے۔ باپ کے یہاں یہ شراب ،شراب معرفت ہے تو بیٹے کے یہاں بادۂ ناب جو بوتلوں میں کھینچی ہوئی رکھی ہے۔ شاید وہ اس کا قائل ہے کہ غم لاکھ دفتر بامعنی سہی مگر اس کو شراب میں ڈبو کر زندہ رہنے کا حوصلہ اور تازگی حاصل کی جا سکتی ہے۔

مستی کی مجھے بھی خواہشیں ہیں　　اس عقل کو دل سے کاہشیں ہیں
بے ہوش شراب ناب رہئے　　یوں تا بہ کجا کباب رہئے

ان اشعار یا اس پوری مثنوی کو پڑھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ میرؔ زمانہ سے بیزار، زندگی سے بیزار، غم پرست، الم پرست اور یاس پرست تھے۔ شراب اور شرابی کی اتنی جاندار تصویر میرؔ نے پیش کی ہے کہ اسے پڑھ کر قاری کو وجد آ جاتا ہے۔ وہ عقل کی کاہشوں سے پریشان تھے اور مست رہنا چاہتے تھے۔ کباب رہنا ان کا مزاج نہ تھا۔ وہ شراب کی مستی میں غم زمانہ کو بھلا دینا چاہتے تھے۔ میرؔ شراب کے پورے لوازمات سے واقف نظر آتے ہیں۔ وہ اوقات شراب بھی جانتے ہیں اور آداب شراب نوشی بھی۔ وہ چھک کر پینا چاہتے ہیں جوش و فراق کی طرح یا رند سحر خیز کے مانند شاید یہ فرحت و انبساط تو ہمیں غالب کے یہاں بھی نظر نہیں

آتا سوائے مثنوی ابر گہربار کے۔

جب سجدہ کناں ہوں صبح خیزاں   جب کاکل صبح ہوں پریشاں
جب نکلے ستارۂ سحرگہ   کر نعرۂ الصبوح یک رہ
ہے ذوق شراب صبح گاہی   بے لطف نہیں بہرد سیاہی
جب ہووے نشہ ترنگ آوے   مستی مجھے باغ میں لگا دے
شیشہ مرے منہ کو تُو لگا دے   کر اسکی نگاہ جو چھکا دے

فن کا کمال یہ ہے کہ شعور و وجدان میں اس حد تک تحلیل ہو جائے کہ جب فن پارہ مکمل ہو تو فن کار خود اس پر رشک کرنے لگے۔ ساقی نامہ اسی قسم کی تخلیق معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ میرؔ خود اس پر نازاں نظر آ رہے ہیں۔ ان کا یہ شہپارہ خود ان کے نزدیک اس حد تک مکمل اور قابل قدر ہے کہ خود میرؔ یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

بس مے سے زباں اب نہ تر کر   مستیِ سخن پہ ٹک نظر کر
ہے نشۂ سامعہ دوبالا   پھر حرف نہ جائے گا سنبھالا

زرِتعاون برائے سال ۲۰۰۵ء

سہ ماہی ''الاقرباء'' کا زیرِ نظر شمارہ سالِ رواں (۲۰۰۴) کا آخری شمارہ ہے۔ کرمفرماؤں اور معاون اداروں سے درخواست ہے کہ زرِتعاون برائے سال ۲۰۰۵ء دسمبر ۲۰۰۴ء کے آخر تک ارسال فرمادیں تاکہ آئندہ سال ''الاقرباء'' کی ترسیل جاری رہے۔ (ادارہ)

سید مرتضیٰ موسوی

بیسویں صدی میں ایران اور برصغیر کی فارسی شاعری

شعر و ادب تہذیب فکر، پرورش اندیشہ، محرک عمل اور انگیزۂ کار و کوشش کا سرچشمہ ہے، جس سے ہر دور کے صاحب نظر فیضیاب ہوتے رہے ہیں۔ جوش ملیح آبادی کی فارسی شاعری سے دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ ۱۹۵۰ء کی دہائی میں اس وقت کے تہران یونیورسٹی کے اردو زبان کے استاد ڈاکٹر شہریار نقوی کو لکھا ''میں نے نوجوانی سے اب تک حافظ کے دیوان کے مختلف ایڈیشنوں کو حاصل کر کے ان کا اس کثرت سے مطالعہ کیا ہے کہ وہ سب عاشق کے گریبان کی طرح پارہ پارہ ہو چکے ہیں''۔ ہمارے عہد کے عالمگیر شہرت کے حامل سائنسدان سے ایک ریڈیائی انٹرویو میں پوچھا گیا۔ آپ کا بنیادی شعبہ سائنس ہے پھر آپ کو شعر و ادب سے اتنی دلچسپی کیسے پیدا ہوئی کہ آپ کو فارسی/اردو کے ہزاروں شعر ازبر ہیں۔ انہوں نے جواب دیا: سائنس آدمی کو سائنسدان بناتا ہے۔ بے شک اپنے عہد کی سائنس، ٹیکنالوجی اور جدید علوم و فنون کی تعلیم، مہارت اور تخصص سے بہرہ مند ہونا۔ ہماری انفرادی اور اجتماعی ذمہ داری ہے۔ مگر اپنے شعر و ادب و ثقافتی ورثے سے لاتعلقی ہمیں اپنی منزل سے دور کر دیتی ہے۔

اس مقالہ میں ''ایران اور برصغیر کی فارسی شاعری بیسویں صدی میں'' کا دو حصوں میں جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔ پہلے حصے میں ایران اور دوسرے حصے میں برصغیر میں فارسی شاعری کے بارے میں گفتگو کی جا رہی ہے۔

بیسویں صدی عیسوی کے ربع اول میں ایران میں قاجاری خاندان برسر اقتدار تھا۔ دوسرے اور تیسرے ربع میں پہلوی شاہنشاہوں نے فرمانروائی کی اور آخری ربع کے ابتدائی برسوں میں اسلامی انقلاب کے نتیجے میں اسلامی جمہوریہ کا قیام عمل میں آیا۔ بنابریں ہم حسب ذیل تین ادوار کا الگ الگ تذکرہ مناسب سمجھتے ہیں:

الف: دستوری حکومت کے قیام کی تحریک سے قاجاری دور کے خاتمے تک (۱۹۲۴ء)

ب: پہلوی خاندان کے دو بادشاہوں کا عہد (۱۹۲۴-۱۹۷۹ء)

ج: فروری ۱۹۷۹ء میں اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد سے اب تک۔

پہلے دور کے ممتاز شعراء میں جنہوں نے استبدادی نظام کے خلاف آواز بلند کی اور دستوری (مشروطہ) حکومت کے قیام کی تحریک میں نمایاں حصہ لیا۔ عوام کے حقوق اور حصول آزادی فکر و عمل جن کا مطمح نظر تھا۔ اشرف نسیم شمال، عارف قزوینی، رشید یاشمی، ایرج میرزا، پروین اعتصامی، ابراہیم پورداود اور محمد تقی بہار ملک الشعراء شامل ہیں۔ بہار نے اپنی نظم میں قاچاری حکمران کو "اندرز (نصیحت) بہ محمد علی شاہ" کے عنوان کے تحت یوں مخاطب کیا:

پادشاہا چشم خرد باز کن!	فکر سرانجام در آغاز کن!
باز گشا دیدۂ بیدار خویش	تانگری عاقبتِ کار خویش
مملکت ایران بہ بہادرفت	بس کر براو کینہ بیداد رفت
پادشہا خوی تو دلہبد نیست	جان رعیت زتو خرسند نیست
وای بہ شاہی کہ رعیت کش است	حال خوش ملت از وناخوش است

عارف قزوینی نے اسی محمد علی شاہ قاچار کو مخاطب کر کے کہا:

کاش کابینۂ زلفت شود از شانہ پریش	کو پریشانی ماجملہ مہیا دارد
ہاکہ این در دو اں گفت کہ والا حضرت	در نیا بہت روش حضرت والا دارد

لیکن جب دستوری حکومت کے قیام کی تحریک کامیابی سے ہمکنار ہوئی تو عارف قزوینی یوں گویا ہوئے:

پیام دوشم از پیری فردش آمد	بنوش بادہ کہ یک ملتی بجوش آمد
زخاک پاک شہیدان راہ آزادی	ببین کہ خون سیاوش چساں بجوش آمد

دوسرے دور میں جو ۷۵ سال پر محیط ہے، پہلے دور کے بعض شعرا کے علاوہ جو کئی عشروں تک بقید حیات رہے نیما یوشیج' میرزادہ عشقی' ابوالقاسم لاھوتی' صادق سرمد' محمد حسین شہریار' سیاوش کسرائی' فروغ فرخزاد' سیمین بہبہانی اور سہراب سپہری کے علاوہ ایسے کئی ممتاز شعراء نے شعر گوئی میں مقام حاصل کیا، جن کی بنیادی شناخت نقد و تحقیق' استادی دانشگاہ و مدیریت مجلہ تھی منجملہ علی اکبر دہخدا' محیط طباطبائی' پروفیسر سعید نفیسی' پروفیسر بدیع الزمان فروزانفر' حبیب یغمائی' ڈاکٹر پرویز ناتل خانلری' ڈاکٹر ناظرزادہ کرمانی۔ اس دور کی آخری دہائیوں میں پژمان بختیاری' محمد علی ناصح' عباس فرات' ذکائی بیضائی' مہرداد اوستا' مشفق کاشانی اور عبدالرفیع حقیقت تہران کی ادبی انجمنوں کے روح رواں رہے۔

اسلامی انقلاب کے بعد، گزشتہ دور کے بقید حیات شاعروں کے علاوہ محمد علی بہمنی، پرویز بیگی، ضیاءالدین ترابی، نصراللہ مردانی، فاطمہ راکعی، حمید سبزواری، سہیل محمودی، علی موسوی گرمارودی، پرویز عباس، فریدون مشیری، علی رضا قزوہ، قیصر امین پور، طاہرہ صفارزادہ، ثابت سہیل، یوسف علی میر شکاک، رضا ملکیات اور زہرا تاریخی اور دوسرے ہم عصر ایرانی شعراء کے کلام میں مقتضیات عصر کا گہرا ادراک، عمیق فکر اور انقلابی سوچ کی عکاسی آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔ اسلامی انقلاب کے ڈیڑھ سال کے اندر استعمار کے بہکاوے میں آ کر عراقی آمر نے ایران پر جنگ مسلط کی جو ساڑھے آٹھ سال جاری رہی۔ رضا ملکیات نے "پاسخ" کے عنوان کے تحت آزاد نظم میں کتنا خوبصورت پیغام دیا ہے!

"تو چرا می جنگی؟"

پسرم می پرسد!

من تفنگ بر دوش

کولبارم بر پشت

بند پوتینم را محکم می بندم

مادرم

آب و آئینہ و قرآں در دست

روشنی بر دل من می بارد

پسرم بار دگر می پرسد:

"تو چرا می جنگی؟"

با تمام دل خود می گویم

"تا چراغ از تو نگیرد دشمن"

اسی دور میں رہبر انقلاب کی عرفانی شاعری کا چرچا رہا:

تا روی تو را دیدم و دیوانہ شدم	از هستی و هر چه هست بیگانہ شدم
بیخود شدم و از خویشتن و خویشی ها	تا مست ز یک جرعۂ پیمانہ شدم

"انا الحق" اور "منصور" امام خمینی کی شاعری میں "اشاریت" اور رمز کے طور پر نمایاں ہیں:

فارغ از خود شدم کوس "اناالحق" بزدم _____ همچو "منصور" خریدار سردار شدم

فریاد "اناالحق" رہ "منصور" بود _____ یا رب مددی کہ فکر راہی بکنیم

عشق دلدار چناں کرد کہ "منصور" منش _____ از دیار رم بہ درآور دوسر دارم کرد

گذشتہ صدی میں ایران کی شاعری میں مختلف رجحانات کا آغاز و ارتقاء، تحلیل و تجزیہ، شعری قالب اور اسلوب، دعوت تہذیب نفس اور اصلاح معاشرہ اور طنز آمیز مضامین تفصیل طلب ہیں اور ہر ایک کے ضمن میں سیاسی، اقتصادی معاشرتی عوامل کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنی ضروری ہوگی چنانچہ کسی اور موقع کے لئے اٹھا رکھتے ہیں۔

اب برصغیر میں بیسویں صدی کی فارسی شاعری پر توجہ مقصود ہے، جب برصغیر پر بیسویں صدی کا سورج طلوع ہوا، فارسی شاعری کی مسلمہ روایت اس سرزمین میں ۹ (نو) صدیوں پر محیط تھی یعنی راہبۂ قزداری، نکتی لاہوری سے غالب اور آرزو تک۔ ہم برصغیر کی فارسی شاعری کو اس عہد میں دو نمایاں حصوں میں تقسیم کر کے زیر مطالعہ لائیں گے یعنی ۱۹۰۰ء سے ۱۹۴۷ء جب برصغیر انگریز کی غلامی سے آزاد ہو کر پاکستان اور بھارت میں تقسیم ہوا۔ پھر آزادی کے بعد سے ۲۰۰۰ء تک جس کے دوران ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان "بنگلہ دیش" کے قالب میں ڈھل گیا۔

برصغیر کے جن شعرا کو ہم فارسی شعرا کے طور پر متعارف کررہے ہیں ان میں سے اکثریت ذولسانین اور بعض ۳، ۴ یا اس سے زیادہ زبانوں میں معیاری شاعری کے حامل ہیں۔ پہلے دور کے سرکردہ شاعروں میں الطاف حسین حالی (م ۱۹۱۴ء)، محمد شبلی نعمانی (م ۱۹۱۴ء)، گرامی جالندھری (م ۱۹۲۷ء) اور سب سے ممتاز اور عالمی شہرت کے فلسفی شاعر علامہ اقبالؒ (م ۱۹۳۸ء) جن کے بارے میں ایران کے عہد حاضر کے ممتاز شاعر ادیب، نقاد اور استاد ملک الشعراء بہار نے کہا ہے:

دور حاضر خامۂ اقبال گشت واحدی کز صد ہزاراں بر گذشت.

اسی دور میں صدیوں سے موجود فارسی شاعری کی روایت کے امین شعراء میں رعنا کاظمی (م ۱۹۳۱ء)، فیروز طغرائی (م ۱۹۳۶ء)، قاسم یاسینی (م ۱۹۳۱ء)، یوسف عزیز مگسی (م ۱۹۳۵ء)، ابوبکر مستونگی (م ۱۹۳۷ء) نے برصغیر کے بیشتر ان صوبوں میں جو آج پاکستان کا جزو لاینفک ہیں، فارسی میں معتدبہ کلام

یادگار چھوڑا ہے۔ فیروز طغرائی کی غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

بس درد دلم داد کہ درماں شدنی نیست ـــــ بس مشکلم افتاد کہ آساں شدنی نیست

از سرمہ نگاہ تو بہ تقدیم رسانید ـــــ آن کار کہ از تیغ صفاہاں شدنی نیست

گیسوی تو بگرفت سیاہی و درازی ـــــ از تیرہ شب من کہ بہ پایاں شدنی نیست

آزادی کے بعد کے عہد میں ہم جن شعراء کا تذکرہ کر رہے ہیں ان میں اچھی خاصی تعداد آزادی سے قبل بھی شاعر کے طور پر اپنا مقام و منزلت کی حامل تھی لیکن چونکہ ان کا سال وفات آزادی کے بعد ہے بنابریں نقد و نظر کے مسلمہ اصولوں کی پیروی کی گئی ہے۔ آزادی کے بعد کے دور میں فارسی کے ممتاز شعراء میں داود خان اختر شیرانی (م ۱۹۴۸ء)' ڈاکٹر محمد دین تاثیر (م ۱۹۵۰ء)' اصغر علی روحی لاہوری (م ۱۹۵۴ء)' زیب مکی (م ۱۹۵۳ء)' رضا علی وحشت (م ۱۹۵۶ء)' مولانا ظفر علی خان (م ۱۹۵۶ء)' عزیز الدین احمد عظامی (م ۱۹۵۷ء)' سردار عبد الرب نشتر (م ۱۹۵۸ء)' اسد ملتانی (م ۱۹۵۹ء)' عبد المجید سالک (م ۱۹۵۹ء)' مرتضیٰ احمد خان میکش (م ۱۹۵۹ء)' مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری (م ۱۹۶۲ء)' حادی مچھلی شہری (م ۱۹۶۳ء)' علامہ عنایت اللہ خان مشرقی (م ۱۹۶۳ء)' ناظم سندھی (م ۱۹۶۴ء)' ممتاز حسن احسن (م ۱۹۶۸ء)' عنایت علی ضیاء جعفری (م ۱۹۷۰ء)' جگر کاظمی (م ۱۹۷۲ء)' ادیب فیروز شاہی (م ۱۹۷۳ء)' حفیظ ہوشیار پوری (م ۱۹۷۳ء)' تبسم قریشی (م ۱۹۷۳ء)' پروفیسر محی الدین خلوت' انور فیروز پوری' آغا حسین ارسطو جاہی' آغا صادق (م ۱۹۷۶ء)' ماہر القادری (م ۱۹۷۶ء)' ذہین تاجی (م ۱۹۷۸ء)' صوفی غلام مصطفیٰ تبسم (م ۱۹۷۸ء)' شیخ محمد ایوب (م ۱۹۸۱)' جوش ملیح آبادی (م ۱۹۸۲ء)' محمد حسین عرشی امرتسری (م ۱۹۸۵ء)' رئیس امروہوی (م ۱۹۸۸ء)' ڈاکٹر خواجہ عبد الحمید عرفانی (م ۱۹۹۰ء)' پروفیسر عبد الرشید فاضل (م ۱۹۹۰ء)' عطاء اللہ خان عطا (م ۱۹۹۱ء)' ڈاکٹر زبیدہ صدیقی (م ۱۹۹۳ء)' رضا ہمدانی (م ۱۹۹۴ء)' حسنین کاظمی شاد (م ۱۹۹۶ء)' پروفیسر کرم حیدری' پروفیسر فیض الحسن فیضی' پروفیسر صفی حیدر دانش' حافظ مظہر الدین' حکیم یحییٰ خان شفا' ڈاکٹر حامد خان حامد' پروفیسر حضور احمد سلیم شامل ہیں۔

اب مناسب ہوگا کہ ان فارسی شعراء کا تذکرہ کیا جائے جن کی شاعری کا آغاز تو بیسویں صدی کی مختلف دہائیوں میں بہ تقاضای سنی ہوا لیکن اکیسویں صدی کے پہلے عشرے (اگست ۲۰۰۲ء) میں بحمد اللہ بقید حیات ہیں:

اسلام آباد/راولپنڈی میں مقیم پیر نصیر الدین نصیر، پروفیسر انور مسعود، فضل الرحمٰن عظیمی، حسن سلمان رضوی، محمد ظہور الحق ظہور، بشیر حسین ناظم، نیسان اکبر آبادی، عارف جلالی، فضل الٰہی زیدی، ظہیر عالم زیدی، پروفیسر رضیہ اکبر، ڈاکٹر سرفراز ظفر، جاوید اقبال قزلباش، نفیس خوارزمی اور کئی دیگر حضرات اور خواتین۔ لاہور میں ڈاکٹر محمد اکرم اکرام، ڈاکٹر آفتاب اصغر، ڈاکٹر معین نظامی، ڈاکٹر یامین خان لاہوری۔ کراچی میں حسین انجم، پروفیسر محمد جان عالم، ڈاکٹر جعفر حلیم، حیدر آباد میں ڈاکٹر الیاس عشقی، ملتان میں ڈاکٹر اسلم انصاری، ڈاکٹر عاصی کرنالی، لیہ میں ڈاکٹر خیال امروہوی، سیالکوٹ میں ضیاء محمد ضیاء اور دیگر فارسی شعراء جو ملک کے مختلف شہروں اور اضلاع میں زمینِ سخن کی آبیاری میں مشغول ہیں۔

۱۹۴۷ء کے بعد بھارت میں فارسی شاعری کے علمبردار اغلب فارسی زبان وادب کے اساتذہ مخصوص دانشگاہوں کی سطح پر رہے ہیں، جن میں ڈاکٹر ساتیانند جاوا تخلص بہ رعد (م ۱۹۹۴ء)، ڈاکٹر ہیرالال چوپڑا (م ۱۹۹۴ء)، پروفیسر محمد صدیق (م ۲۰۰۰ء)، شمیم جے پوری، پروفیسر سید وحید اشرف، پروفیسر ولی الحق انصاری، صابر ابوھری، ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی اور دیگر فارسی گو شامل ہیں۔

بنگلہ دیش کے علمی، تحقیقی اور ادبی حلقوں میں فارسی زبان کی شاہکار تصانیف سے کسب فیض کے لئے بیسویں صدی کے نصف دوم میں شاہنامۂ فردوسی، مثنوی مولانا رومی، گلستان و بوستان و اشعار سعدی، دیوان حافظ، اقبال کے فارسی کلام کے متعدد تراجم بنگالی زبان میں کیے گئے، جن میں سے بیشتر ڈھاکہ میں شائع ہوئے۔ گذشتہ صدی میں قاضی نذر الاسلام جنھیں قومی شاعر کا مرتبہ حاصل ہے اس کام کے بانیوں میں شامل ہیں۔ نذر الاسلام نے حافظ کی غزلوں اور رباعیوں کے بنگالی میں ترجمے کیے جو مقبول ہوئے۔ اسی طرح عمر خیام کی رباعیات کو بھی انہوں نے بنگالی میں ڈھالا۔ قاضی نذر الاسلام کی فارسی زبان سے دلچسپی کے نتیجے میں ان کی اپنی بنگالی شاعری میں فارسی الفاظ، ترکیبات اور اصطلاحات نے جگہ بنائی ہے۔ ایک ممتاز بنگالی محقق نے بنگالی زبان میں رائج فارسی الاصل الفاظ کا تخمینہ چھ ہزار لگایا ہے، جہاں تک فارسی شاعری کا تعلق ہے۔ مشرقی پاکستان کے دور میں رضا علی وحشت اور ڈاکٹر عندلیب شادانی نہایت ممتاز ہیں۔ پروفیسر عندلیب شادانی اس ثقافتی وفد کے رکن تھے جو ۱۹۵۳ء میں ایران کی وزارت تعلیم کی دعوت پر ڈاکٹر مولوی محمد شفیع کی قیادت میں ایران گیا۔ کاخ چہل ستون، اصفہان میں پاکستانی وفد کے اعزاز میں ایک دعوت کے دوران ایرانی میزبانوں میں سے کسی نے اس قول کو دہرایا جس میں "اصفہان کو نصف جہان" کہا

جاتا ہے۔ پروفیسر شادانی نے فی البدیہہ ایک قطعہ پیش کیا:

بیچارہ ہیچ "دیدۂ معنی نگر" نداشت	آنکس کہ گفت نصف جہانست اصفہان
مائیم راز دانِ حقیقت ز ما شنو	عالم تمام پیکر و جانست اصفہان

بیسویں صدی کے فارسی شعراء نے اسلام کے فکر و فلسفہ ایران دوستی سے لے کر سعی پیہم امید و رجا عرفان و تصوف پند و نصیحت کو اپنے پیش نظر رکھ کر شاعری کی۔ اسلام اور قرآن سے متعلق چند شعر ملاحظہ ہوں: علامہ مشرقی کہتے ہیں:

راہی کہ بہ منزل نرساند کفراست	طاعت کہ حکومت ندھاند کفراست
ہر عُسر کہ یُسر ش نہ ھویداست خطاست	اسلام کہ غالب نہ کناند کفراست

اختر شیرانی نے کہا ہے:

ناموسِ ملک وقوم بہ قرآں برابراست	قرآں گواہ حرمتِ قرآنم آرزوست

گزشتہ نصف صدی میں بیسیوں فارسی شعراء نے ایران دوستی کے موضوع پر قطعات منظومات اور رباعیات کہی ہیں۔ چند نمونے پیش خدمت ہیں:

سابق سیکرٹری وزارت خزانہ ممتاز حسن احسن کہتے ہیں:

علم و ہنر و دانش و عرفان گرفتیم	ما ہرچہ گرفتیم ز ایران گرفتیم

ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید عرفانی نے کہا ہے

خاکِ شیراز و مشھد و تبریز	سرمۂ نورِ ہر دو چشمانم

حسنی کاظمی شاد:

آں سوز عشق و شور محبت کہ داشتیم	در اصفہان و مشہد و تہراں فرد ختیم

پند و نصیحت کے ضمن میں برصغیر کے فارسی شعرا نے حتیٰ کہ بیسویں صدی میں بڑے نادر خیالات کو قالب شعر میں ڈھالا ہے:

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم:

بیانِ کفر چنیں دلنشیں نباید دست	حدیث شیخ حرم دلنواز باید نیست!

عبدالمجید سالک:

بنوش بادہ و رندی کن و بہ عیش گزار	مگر بہ پیشِ حریفاں مشو ضمیر فروش

شیخ محمد ایوب:

تسلّی پیشکی از من نمی آید نمی آید — کہ از دستِ قضا شیشہ است بی باکی بہ تقدیرم

ایران اور برصغیر میں بیسویں صدی کے تحولات کا پرتو فارسی شاعری میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔
برصغیر بخصوص پاکستان کے فارسی شعراء میں جدید لغات و ترکیبات اور شعری اصناف پر توجہ روز افزوں رہی ہے۔

منابع و کتابیات:

۱۔ فارسی گویان پاکستان (فارسی): ڈاکٹر سید حسن رضوی مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد ۱۹۷۴ء۔
۲۔ وصف پاکستان در شعر فارسی (فارسی): ڈاکٹر محمد حسین تسبیحی انجمن فارسی پاکستان اسلام آباد ۱۹۹۷ء۔
۳۔ ارمغان فارسی (فارسی): ڈاکٹر محمد حسین تسبیحی انجمن فارسی اسلام آباد ۲۰۰۰ء۔
۴۔ ماہنامہ ہلال (فارسی) کراچی ۱۹۵۲ء۔۱۹۷۲ء مختلف شمارے
۵۔ ماہنامہ پاکستان مصور (فارسی) اسلام آباد ۱۹۷۳ء۔۱۹۸۸ء مختلف شمارے
۶۔ فصلنامہ "دانش" (فارسی) اسلام آباد ۱۹۸۵ء۔۲۰۰۴ء مختلف شمارے
۷۔ فصلنامہ قند پارسی (فارسی) ثقافتی قونصلیٹ سفارت ایران نئی دہلی مختلف شمارے
۸۔ سہ ماہی "الاقرباء" (اردو) اسلام آباد جنوری۔مارچ ۲۰۰۴ء مقالہ از ڈاکٹر محمد معز الدین ص ۱۴۔۲۱۔
۹۔ راقم کی یادداشتیں

سید رفیق عزیزی

سید خورشید علی مہر۔ اُردو ادب کا ایک محسوس کردار

کوئی ایک شخص جو محقق ہو، مورخ ہو، مصنف ہو، مؤلف ہو، مترجم ہو، شاعر ہو، پابندِ وقت ہو، وعدہ کا پاسدار ہو، طبیب ہو، پابند صوم و صلوٰۃ ہو، صاحبِ خیر ہو، شیریں گفتار ہو، با مروت ہو، اصولوں کا محافظ ہو، وضعدار ہو، متواضع ہو، ملنسار ہو، منکسر ہو، کسی پر اپنے علم کی دھونس نہ جماتا ہو، دبلا پتلا ہو، سارے بٹن بند کئے شیروانی اور قائد اعظم کیپ میں نظر آتا ہو، علی گڑھ کٹ پاجامہ پہنتا ہو۔۔۔ تو ایسے شخص کو با آسانی صرف اور صرف سید خورشید علی مہر کہا جاسکتا ہے۔

وہ اپنے استادِ سخن میرزا محمد تقی مائل دہلوی (تلمیذ جگت استاد داغ دہلوی) کے نام کی نسبت سے خود کو ''تقوی'' اور اپنے مولد و وطن کی نسبت سے ''جے پوری'' کہلاتے تھے۔

عربی، فارسی، اردو وغیرہ میں تاریخ گوئی سب سے مشکل صنفِ سخن ہے، مادہ ہائے تاریخ برآمد کرنے کی بہت سی اقسام ہیں۔ سید خورشید علی مہر ان تمام اصناف میں تاریخ کہتے تھے۔ تصانیف میں ان کے کارنامے بہت ہیں، جن کا ذکر دوسرے حضرات کرتے آئے ہیں اور کریں گے۔ میرے سامنے ان کے دو بہت بڑے کارنامے ہیں۔ اولاً ان کا تحقیقی کارنامہ ''تذکرہ دُرفشاں'' ہے۔ جس میں انہوں نے تاریخ گوئی کے ابتدائی دور سے اپنے عہد تک نہایت دشوار ذرائع تحقیق سے یہ تذکرہ مرتب کیا، جو عربی، فارسی، اردو، ہندی، انگریزی اور اطرافِ ہند میں بولی جانے والی بہت سی بولیوں میں کہے ہوئے تاریخی مادوں پر مشتمل ہے، اور جسے مشفق خواجہ، ڈاکٹر جمیل جالبی اور جمیل الدین عالی کی کوششوں سے یہ تذکرہ انجمن ترقی اردو کے مجلے اردو میں قسط وار پیش کیا جاچکا ہے۔ تحقیقی کام کرنے کے لئے یہ تحفہ عجیب ہے۔ سید خورشید علی مہر تقوی جے پوری کا دوسرا بڑا کارنامہ علامہ اقبال کی معروف فارسی مثنوی ''رموز بیخودی'' کا منظوم اردو ترجمہ ہے۔ اس ترجمہ کے دوسرے کمالات میں اہم ترین کارنامہ یہ ہے کہ اگر بتایا نہ جائے کہ یہ ترجمہ ہے تو قاری بلا تردد یہ محسوس کرے گا کہ علامہ اقبال نے ہی اپنی فارسی مثنوی ''رموز بیخودی'' کو اردو میں ''ترجمانِ بے خودی'' کے نام سے پیش کیا ہے۔ دراصل ترجمے کا کمال یہی ہے کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کیا گیا ہو تو

اُس پر ترجمہ کا گمان نہ گزرتا ہو۔ بلکہ اصل کتاب کے مصنف کی دوسری زبان میں کی ہوئی تصنیف ہی معلوم ہو۔"ترجمانِ بے خودی" میں یہی کمال موجود ہے۔

مہر تقوی بے پوری با قاعدہ مستند طبیب تھے' لیکن انہوں نے طبابت کو بطور پیشہ اختیار نہیں کیا۔ البتہ اپنے اہلِ خانہ اور میل جول والوں کے وہ معالج ضرور رہے ان کے زیر علاج مریض کو اپنے مرض کے سلسلے میں کبھی دوسرے معالج کی خدمات حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہوئی۔ وہ بہترین فارسی داں تھے۔ اُردو ان کی مادری زبان تھی۔ ہندی زبان بھی انہیں اتنی ہی آتی تھی جتنی کسی ہندی زبان کے ماہر کو آسکتی ہے' انہوں نے عربی کا درس بھی لیا تھا۔ انگریزی انہوں نے صرف انٹرنس یعنی (موجودہ میٹرک) تک پڑھی تھی۔ لیکن انگریزی بھی اتنی اچھی جانتے تھے کہ چیف کورٹ کراچی میں ایڈیشنل ایڈووکیٹ جنرل مغربی پاکستان کے پسندیدہ آفس سپرنٹنڈنٹ تھے۔ وقت اور اصول کی پابندی' یوں معلوم ہوتا تھا کہ اُن کی گھٹی میں شامل کردی گئی تھی۔ زبان وضرب الامثال اور کہاوتوں کی پابندی اور ان کا حُسن تو اُن کی تاریخ گوئی میں بھی برابر موجود رہا ہے۔

بحیثیت شاعر ان کے کلام میں ان کے دادا استاد حضرت داغ دہلوی کا کامل اتباع نظر آتا ہے۔ لیکن معاملہ بندی میں سفلی جذبات سے ان کا کلام پاک ہے۔ انہوں نے لفظوں کی حرمت کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ شرافت و پاکیزگی اُن کے کلام کا زیور ہے۔

نعتیہ رنگ:

حضور نبی اکرم ﷺ کے جسمِ اطہر کے بے سایہ ہونے کا ذکر تمام قدیم وجدید شعراء کے ہاں ملتا ہے لیکن سید خورشید علی مہر نے سایہ نہ ہونے کا سبب نہایت نفیس دلیل سے بیان کیا ہے شعر ہے۔

محمدؐ اصل میں فانوس شمع کبریائی ہیں یہی باعث ہے جو سایہ نہیں تھا آپؐ کے قد کا

حضور اکرمؐ کے مقام ومرتبہ کا بیان نا ممکن ہے اسی وجہ سے میرزا اسد اللہ خاں غالب نے ثنائے مصطفوی بیان کرنے کی کوشش یہ کہہ کر تا قیامت ختم کردی کہ۔

غالب ثنائے خواجہؐ بہ یزداں گزاشتیم کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

لیکن مہر تقوی بے پوری نے "کوئی تہ کو نہ پہنچا" کہہ کر اس مضمون کا رخ ہی تبدیل کردیا ہے۔

کوئی تہ کو نہ پہنچا اس قدر گہرا تعلق ہے محمدؐ سے خدا کا اور اُمت سے محمدؐ کا

اس "تعلق" کی "تہ" کو نہ کوئی پہنچا نہ پہنچے گا، نہ پہنچ سکتا ہے۔ ذات کو اپنی حقیقت محمدیؐ سے جو تعلق یکتائی ہے۔ اس کی تہ تک کون پہنچ سکتا ہے اور بالکل اسی طور سے اپنی امت کے ہر ایک فرد یا ہر ایک متنفس سے جو حضور ﷺ کو تعلق ہے اس کی نہایت کا عرفان ممکن نہیں ہے۔

نہیں تخصیص، پہلو میں مرے پتھر ہو یا دل ہو　　مجھے تو چاہیے اک آئینہ نورِ محمدؐ کا

اس حسن طلب کی عظمت کا اندازہ کیسے کیا جا سکتا ہے۔ نورِ محمدیؐ کا آئینہ اگر پہلو میں ہو تو اور کیا چاہیے۔ نورِ محمدیؐ کے آئینے کی اس خواہش کے قربان۔

ایک اور نعتیہ شعر ہے:

یہ بہارِ مہر، مہر حسنؐ ہی کی جلوہ فرمائی　　کہ مہر و ماہ اس سے نورِ صبح و شام لیتے ہیں

اس شعر کا تمام تر حسن یہ ہے کہ اس شعر کا ممدوح، حضور سرورِ کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے علاوہ اس عالم آب و گل میں کوئی نہیں ہو سکتا۔ "نور" اور کسبِ نور پر نہایت تفصیل سے مفسرین اور محدثین کے علاوہ عرفائے حق نے گفتگو کی ہے۔

نعت گوئی کے ضمن میں نہایت تکلیف کے ساتھ میں دیگر (مقامات پر بھی) لکھ چکا ہوں کہ شعراء اپنی نعتوں میں خالص غزل کے مضامین کو بیان کر کے بزعمِ خود یہ سمجھتے رہتے ہیں کہ انہوں نے نعت کہہ لی ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ نعتیہ شعر صرف وہ تسلیم کیا جا سکتا ہے جو حضور نبی کریم ﷺ کے سوا کسی متنفس پر صادق نہ آ سکتا ہو۔ شعر میں حضور، مدینۂ طیبہ، غارِ حرا، غارِ ثور جیسے الفاظ استعمال نہ ہوئے ہوں پھر بھی وہ شعر ایسا ہو کہ اس سے حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سوائے کوئی متنفس ہمارے خیال میں نہ آ سکے۔

مہر تقوی سچ پوری کہتے ہیں:

نگہِ جلوہ نگر چاہیے ورنہ اے مہرؔ!　　کونسا جلوہ ہے ایمن میں جو فاراں میں نہیں

یہ شعر فلسفۂ وحدۃ الوجود کا ترجمان ہے۔ ہر چند کہ مہرؔ صاحب کو تصوف سے شغف نہیں تھا لیکن وہ چونکہ سلسلۂ طریقت کے آدمی تھے اور کسی بزرگ کے دست گرفتہ تھے اس لیے اس تعلیم کا اثر آنا فطری اور قدرتی امر تھا۔ یہ شعر بھی نعتیہ ہے اور نہایت جان دار ہے۔ ذات کی صفات کو جلوۂ الٰہی کہا اور مانا گیا ہے ہم جب کرۂ ارض پر سانسیں لیتے ہیں۔ یہ تجلیاتِ الٰہی کی آغوشِ رحمت کے سوائے کچھ نہیں اور اس کی سند قرآن کریم سے پیش کی جا سکتی ہے۔ ارشادِ باری ہے: اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۝ یہ جو کچھ ہم دیکھ رہے ہے

ہیں، محسوس کر رہے ہیں، سونگھ رہے ہیں، چکھ رہے ہیں، پی رہے ہیں، سن رہے ہیں۔ یہ ایک ذات کی صفات متعددہ ہی ہیں اور ذات و صفات کو دو سمجھنا ہی شرک فی الذات ہے۔ یہاں جو موجود ہے وہ سوائے ذات پاک اور کچھ نہیں ہے۔ یہ بکھری ہوئی وہ آیات الٰہی ہیں جنہیں ہم دیکھ کر بھی نہیں دیکھنا چاہتے حالانکہ ارشاد الٰہی ہے جو استفہامیہ انداز میں ہے۔ فرمایا: سَنُرِیْہِمْ آیٰتِنَا (؟) مہر صاحب نے اسی مسئلہ کو اپنے عقیدے اور ایمان کے زور پر بیان کیا ہے۔ مہر صاحب کی غزلوں میں پوری توانائی کے ساتھ فلسفۂ وحدۃ الوجود کی ترجمانی ملتی ہے۔ وہ پوری آسودگی کے ساتھ کہتے ہیں:-

کیسے وہ باریاب ہو تیری حریم "ذات" سے جس کی نگاہ رک گئی حدِ "تعینات" میں

اور کھل کر کہتے ہیں:-

ذوقِ نگاہ چاہئے ورنہ وہ کس جگہ نہیں جلوۂ حُسنِ "ذات" ہے آئینۂ "صفات" میں

نجم ہو، ماہ ہو، نیم ماہ، ذرہ ہو مہرِ نیم روز مہرؔ یہ سب "صفات" ہیں اسکے ہی نور "ذات" میں

"غیر کی محفل" میں جانا کب گوارا ہے ہمیں بزم ہم ہیں، حُسن ہم ہیں، شمع ہم، پروانہ ہم

ہو نہ ذوقِ نگاہ کی توہین دیکھ الجھو "تجلیات" نہ ہو

جس کو ہم نے حیات سمجھا ہے یہ کہیں "سایۂ حیات" نہ ہو

مہرؔ تجھ پہ ہی منحصر کیا ہے "ذرّے ذرّے" میں ہے وہ جلوہ فگن

دیا ذوقِ نظر تم نے تو مشکل ہوگئی آساں شناسائی آب و رنگِ محفل ہوگئی آساں

سید خورشید علی مہرؔ ایک ادبی اور سماجی شخصیت تھے۔ سیاسیات کے جھمیلوں سے انہوں نے کبھی واسطہ نہیں رکھا۔ ریاست جے پور میں تھے تو پولیس کے محکمے میں رہے۔ پاکستان آ گئے تو یہاں ایڈیشنل ایڈووکیٹ جنرل کے دفتر کے سپرنٹنڈنٹ رہے۔ ان کی مومنانہ دیانتداری کے علاوہ ان کی انتھک محنت، کام کی لگن اور سچائی کے جسٹس انعام اللہ، جسٹس قدیر الدین احمد، جسٹس الٰہی بخش غیسانی، جسٹس عبدالقادر شیخ، جسٹس محمد حلیم جیسے مقتدر جج صاحبان اور جناب اے کے بروہی، جناب خالد ایم اسحٰق، جناب اے اے فضیل جیسے ممتاز ماہرینِ قانون بھی معترف رہے۔

مہر صاحب داغ سکول کے غزل گو ہیں۔ وہ تمام تر غیر سیاسی زندگی بسر کرتے تھے۔ لیکن شاعر چونکہ از حد حساس مشاہدات اور ذاتی تجربات کا پیکر ہوتا ہے اس لئے وہ اپنی خارجی زندگی سے نظر نہیں چرا سکتا اور جب اس کے لطیف جذبات اور نازک احساس پر چوٹ پڑتی ہے تو ہزار صبر و ضبط کے باوصف اسے اپنی غزل میں اپنی خارجی دنیا کا ذکر کرنا ہی پڑتا ہے۔ چنانچہ ان پر جو بیتی اس کا اظہار ان کی غزل میں رونما ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ کہتے ہیں:-

سمجھتا ہوں کہ خود اہلِ چمن کا ہاتھ تھا اس میں ۔۔۔ یہ بربادی چمن کی ورنہ اتنی تو نہ تھی آساں

کبھی ہے یادِ ماضی اور کبھی تشویش مستقبل ۔۔۔ نہیں اے مہر اب جینا چمن میں رہ کے بھی آساں

یہ عالمِ تشنگی کا مہر قیامت تک نہ آئے گا ۔۔۔ ذرا سے مسکرانے کو سمجھتی ہے کلی آساں

قفس میں ہو گئی تجدیدِ احکامِ زباں بندی ۔۔۔ غلط ہے یہ کہ فریادِ عنادل ہو گئی آساں

اب کہاں دورِ طرب خیز وہ میخانے کا ۔۔۔ دورِ افلاک ہے جو دور ہے پیمانے کا

جہانِ پُر خطر کی شورشوں سے ہم بچے رہتے ۔۔۔ جو مڑ کر دیکھ لیتے زیست کے ہر موڑ پر پہلے

تھا بہار آفریں کو جس پر ناز ۔۔۔ وہ چمن ہو رہا ہے نذرِ خزاں

(یہ تمام کلام ۱۹۵۹ء ـ ۶۲ تک کا ہے)

یہ اشعار الگ سے نہیں کہے گئے ہیں۔ بلکہ ان کی غزلوں میں شامل ہیں۔ یہی وہ تصویر ہے کہ شاعر کے محسوسات کے کینوس پر اُبھر کر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ ایک خالص غزل گو کے دل پر کیا گزرتی ہوگی، جو وہ اپنے احساس کے زخموں کو چھپا نہ سکتا ہو۔

مہر تقوی بے پوری کا کلام جو مجھ تک پہنچ سکا ہے وہ ان کی غزلیات پر مشتمل ہے۔ انہوں نے اپنے عہد میں کافی جاندار غزلیں کہی ہیں۔ تقسیم ہند سے بہت پہلے میں ان کی غزلیں ماہنامہ ''شاعر'' (آگرہ) میں پڑھتا رہا تھا۔ ماہنامہ ''شاعر'' مولانا سیماب اکبر آبادی کا مجلہ تھا۔ اس میں شائع ہونے والے کلام کو اس دور کا معتبر کلام سمجھا جاتا تھا۔ مولانا سیماب فنِ شعر کے بہت سخت نقاد تھے اور ان کی فنی کسوٹی پر ''کھرا'' ہونے سے پہلے کوئی شعری فن پارہ ماہنامہ ''شاعر'' آگرہ میں شائع نہیں ہو سکتا تھا۔

اردو شعر و سخن پر مختلف دور آتے رہے ہیں اور دیگر زبانوں کے ادبا و شعراء نے بھی یہ وقت دیکھے

ہیں۔ فارسی، عربی، انگریزی، فرانسیسی کی طرح اردو زبان کی شاعری میں یہ انقلاب آیا۔ ترقی پسند ادب اور رجعت پسند ادب کے نام سے ہمارا سرمایہ شعری دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ جو گزشتہ چالیس سال میں "روایتی شاعری" اور "جدید شاعری" کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ اردو شاعری میں اکابرین شعر جو کچھ کہہ گئے ہیں، وہی مضامین جدید لفظیات اور اپنے موہومہ وضع کردہ چند استعاروں، تشبیہوں، اشاروں، کنایوں سے دہرائے جا رہے ہیں جو روایتی شعری ترکہ ورثہ کا خزانہ چھوڑا گیا ہے۔

جدید فکر و بیان کے مدعی آسمان کے تارے نہیں توڑ سکتے اس لئے کہ وہ سب کچھ کہا جا چکا ہے، جو کہہ رہے ہیں اور کہہ سکتے ہیں۔ سیکولر ذہن و فکر رکھنے والوں نے اگرچہ "ترقی پسند" اور "رجعت پسند" کی اصطلاح کو عام کیا تھا، اب (آج) وہی بات نئی اصطلاح میں "روایتی" اور "جدیدتر" کہی جا رہی ہے۔ باقی ڈھاک کے تین پات۔ آج عہد جدید کے شعراء صرف وہ ہیں جن کی شاعری کی عمر بہت سے بہت پندرہ برس کی ہے اور جن کے استاد وہ خود ہی ہیں۔ سید خورشید علی مہرؔ نقوی جے پوری کو ہم سے جدا ہوئے اڑتیس (۳۸) برس گزر چکے ہیں لیکن ان کے ادبی کارنامے اس وقت تک زندہ رہیں گے جب تک اردو زبان کا وجود ہے۔

مہرؔ صاحب کی غزلوں میں سے صرف وہ اشعار (جو قطعی غیر منتخبہ ہیں) پیش کرنے سے پہلے یہ کہنا ضروری ہے کہ ان کی غزلیات پر رائے دینے کے لئے کلیم الدین احمد یا ڈاکٹر زورؔ قادری کے علم کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ مولانا شبلی اور مولانا حالیؔ پانی پتی کے دل و دماغ اور ان کے معاصرین کے افکار کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ تنقید کا اصول یہ نہیں ہے کہ اس دور کی سماجی اقدار، اس دور کی تاریخ، اس کی روایات، اس دور کے ادبی تقاضوں کی جگہ مغربی انداز حیات اور ان کی روایات و سماجیات کی ترازو میں پچھلی صدی کے کسی شاعر کے کلام پر اپنی تنقید کا کُند خنجر چلائیں یہ قرینِ انصاف نہ ہوگا۔ ہم مہرؔ صاحب کے کلام کو انھیں کے دور میں رہ کر دیکھیں تو اُن کی قدر آوری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

لہو رگوں سے سنا اُچھلا گلوئے بسمل کا ____ بوقتِ ذبح بھی پاسِ ادب ہے قاتل کا

تم اپنے حُسنِ دلکش کی ادا آئینے میں دیکھو ____ یہ تم نے کیا کہا، مشتاق کیوں ہے ہر بشر میرا

اب کہاں طاقتِ جدائی ہے ____ اب کہاں دل پہ اختیار رہا

دیوانہ جان کر نہ کوئی ہم سخن رہا ___ اپنا تو پردہ دار یہ دیوانہ پن رہا

بندہ ایسے کہ آ جائیں یہاں تک ___ نہ میں اتنا کہ جا پہنچوں وہاں تک

مہر صاحب نے حیاتِ حقیقی اور مماتِ ظاہری کے اصل مسئلے کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ جب وہ یہ کہتے ہیں کہ:

نہ جس دل میں جینے کی ہوس تک ___ وہ مر سکتا نہیں لاکھوں برس تک

ہیں شکستہ در و دیوار مگر ہیں تو سہی ___ عظمتیں مٹ گئیں آثار مگر ہیں تو سہی

اُف وہ عالم کہ نہ دشمن ہو نہ ہو دوست کوئی ___ دوست ہیں دشمنِ خوں خوار مگر ہیں تو سہی

ان دونوں اشعار میں ایک رجائی اندازِ فکر ہے۔ جس کے خلاف بولنے اور سوچنے والوں کی اکثریت رہی ہے جبکہ انسانی معاشرے میں اس طرح سوچنے والے ہر دور میں رہے ہیں اور اسی کے بل بوتے پر انسانی معاشرے کی گاڑی چلتی رہی ہے اور چل رہی ہے۔ یہ "ہیں تو سہی" میں جذبۂ شکر ہے۔ دراصل ہمارے معاشرے کو اسی سوچ کی ضرورت ہے۔ جو کم سے بھی کم ہوتی جا رہی ہے۔

شام ہی سے کیوں نہ کو بچھے اپنی آنکھیں فرشِ راہ ___ صبح تک دل کو کسی صورت سے بہلانا بھی ہے

انتظار اور تذبذب کی ملی جلی ایک بڑی پُر امید اور نہایت پُر سوز نفسیاتی کیفیت کی کامیاب تصویرکشی ہے شعر میں یقین و بے یقینی بار ہا وعدہ ایفا نہ ہونے کے تجربے اور اس کے باوصف ولولۂ امید کی حسین عکاسی کی گئی ہے۔

چمن پیرا! چمن آرائیاں تیری مسلم ہیں ___ مگر اہلِ چمن کو امتیازِ رنگ و بُو مشکل

اہلِ ظواہر چونکہ رنگ و بُو کے امتیاز سے اس لئے محروم رہتے ہیں کہ ان کی نظر رنگ و بُو کے اندر جھانک کر ان کی حقیقت تک نہیں پہنچ پاتی' اس لئے یہ گلہ یا شکوہ کہا جا سکتا ہے۔ مگر اس شعر میں "حسنِ طلب" کا فن بھی شامل ہے۔ چنانچہ جو عرض کیا گیا اس کی دلیل غزل کے مقطع میں موجود ہے۔ وہ کہتے ہیں:۔

یہ ہے پاسِ ادب اے مہر! ان کی شانِ عالی میں ___ کہ اظہار تمنا بھی ہے اُن کے رُو برُو مشکل

انھوں نے پھر ایک بار وجود یا شہود کی اکائی یا وحدت کا ذکر کیا اور اہلِ ظاہر کو غور و فکر کی دعوت دی ہے

بزمِ دل، بزمِ نظر، بزمِ خیال و احساس ___ کونسی بزم ترے جلووں سے معمور نہیں

مہر صاحب کی غزلیں صنائع بدائع سے مالا مال ہیں علمِ بیان کے ارکان (تشبیہ، استعارہ، کنایہ اور مجاز مرسل) عروسِ شعر کے وہ زیور ہیں، جن سے اس کی دلکشی و جاذبیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ صنعت تضاد، تنسیق الصفات، مراعاۃ النظیر، حسن تعلیل اور لف و نشر ان غزلوں کے جوہر تیکھے ہیں۔ اہلِ علم میری اس رائے کی تصدیق کریں گے۔ مثالیں پیش کرنے سے طوالت پیدا ہو جائے گی۔ (جس کا وقت اب قاری کے پاس نہیں رہا ہے)۔

عمرانیات کے محققین کی رائے ہے کہ ایک اچھا آدمی ہی اچھا شاعر ہو سکتا ہے۔ وہ شرفِ انسانی کو مجروح نہیں ہونے دیتا۔ میں ذاتی طور پر اس کا گواہ ہوں کہ انسان کے کام آنے کا جیسا جذبۂ خیر اور احسان مسلسل کرتے رہنے کی جو صفت مجھے ان میں ملی اس کی مثال کم از کم میرے علم میں اس وقت تک نہیں آئی ہے۔

ڈاکٹر شاہد حسن رضوی

تحریک پاکستان۔ خواتین کی بیداری میں قائد اعظم اور مادر ملت کا کردار

ایک تجزیاتی مطالعہ (۱۹۲۷ء۔۱۹۳۶ء)

تاریخ انسانی ہمت و جواں مردی کے کارہائے نمایاں سے لبریز ہے اور روز اول ہی سے کارزار حیات میں مرد اور عورت کی رفاقت زندگی کے کٹھن مراحل میں کامیابی کے تسلسل کی امین اور روشن دلیل رہی ہے۔ ورود آدم علیہ السلام سے لے کر ظہور اسلام تک عورت نے تہذیب انسانی کے افضل ترین صحیفۂ حیات کے انطباق اور استمرار کو یقینی بنانے کے لیے اماں حوا، حاجرہؓ، سائرہؓ، بی بی آمنہؓ، حضرت خدیجہؓ، حضرت عائشہؓ اور حضرت فاطمۃ الزہراؓ کی صورت میں اپنی خدمات پیش کیں اسلام کا سورج سرزمین عرب سے طلوع ہو کر نصف النہار برصغیر پر پہنچا تو اس کی مقدس کرنوں کے پیغام کی امانت کو یہاں کی غیور خواتین نے گلے لگایا۔ یہ سلسلہ رضیہ سلطانہ، نور جہاں اور چاند بی بی سے چلتا ہوا، متحدہ برصغیر کی اخیر دہائیوں میں سیاسی افق پر قوس قزح کے رنگوں کی طرح چمکنے والی فاطمہ جناح پر منتج ہوا۔

۱۹۲۸ء تا ۱۹۳۹ء کی دو دہائیاں، برصغیر کی ہزار سالہ مسلم تاریخ کے سامنے اگرچہ ایک ذرے سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتیں لیکن انہی دو دہائیوں نے برصغیر کی سیاسی اور جغرافیائی صورت تبدیل کر کے رکھ دی۔ کیونکہ برصغیر میں مسلم سیاست کے عروج کا دور، یہی دورانیہ ہے۔ قائد اعظم محمد علی جناح سے ایک مرتبہ سوال کیا گیا کہ انہیں پہلی مرتبہ ایک علیحدہ مملکت کے حصول کا خیال کب آیا؟ آپ نے بلا تامل جواب دیا۔ ۱۹۳۰ء کے دوران کیونکہ جناح نہ صرف یہ کہ کانگریس کے رویہ سے مایوس ہو چکے تھے بلکہ ہندوؤں کی کہہ مکرنیوں کا جو سلسلہ میثاق لکھنؤ سے انحراف، تحریک خلافت میں گاندھی کی مکاری، تجاویز دہلی سے بے اعتنائی، جداگانہ انتخاب کے مطالبہ سے فرار کی صورت میں بغیر رکے جاری تھا۔ ۱۹۳۰ء کی پہلی گول میز کانفرنس میں قائد اعظم کے مسلم نصب العین کو وضع کرنے کا سبب بنا۔

۱۹۲۹ء میں قائد اعظم کی اہلیہ محترمہ رتی جناح کا انتقال قائد اعظم کے لیے ایک صدمہ سے کم نہیں تھا۔ کیونکہ قائد اعظم کی قانونی اور سیاسی ذمہ داریاں وسیع سے وسیع تر ہوتی جا رہی تھیں ان دنوں قائد اعظم بمبئی کے پرشکوہ علاقہ مالابار میں محترمہ فاطمہ جناح اور دس سالہ بیٹی دینا جناح کے ساتھ قیام پذیر تھے محترمہ

فاطمہ جناح نے ملک وقوم کے وسیع تر مفاد میں اور قائداعظم کے طے کردہ نصب العین کے حصول کے لیے مسلم خواتین کے سامنے ذاتی قربانی کی لازوال مثال پیش کی۔ وہ نہ صرف قائداعظم کی سب سے وفادار اتحادی ثابت ہوئیں بلکہ انہوں نے اس ناقابل شکست رشتہ کو قائداعظم کی زندگی کے آخری لمحات تک نبھایا۔ مولانا محمد علی جوہر اکثر لوگوں کو بتایا کرتے کہ ان کی طاقت کا راز ان کی گفتار، قلم کی رفتار اور ان کے بھائی مولانا شوکت علی ہیں جبکہ قائداعظم کا کہنا تھا کہ میرے سیاسی کیریئر کا انحصار دو چیزوں پر ہے فاطمہ جناح اور میرا ٹائپسٹ۔ قائداعظم جب گول میز کانفرس میں شرکت کے لیے وزیراعظم برطانیہ ریمزے میکڈونلڈ کی دعوت پر لندن گئے تو محترمہ فاطمہ جناح بھی ہمراہ تھیں۔ آپ، فاطمہ جناح ہی کے ایماء پر اپنے بمبئی کے روایتی حریف لارڈ ولنگڈن سے بھی ملے، جن کا تقرر بطور وائسرائے ہند ہو چکا تھا۔ آپ نے ملاقات کے دوران مسلمانوں کے سیاسی نظریات کی وضاحت کے ساتھ ساتھ گول میز کانفرس میں اختیار کردہ موقف کو بھی بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا۔ قیام برطانیہ کے دوران آپ کو یہ پیشکش بھی ہوئی گول میز کانفرس میں تعاون کے صلہ میں انہیں انڈیا کے کسی صوبے کا گورنر بنایا جاسکتا ہے، لیکن آپ نے اس پیشکش کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیا۔ بلکہ آپ نے آئندہ دوسری اور تیسری گول میز کانفرنس کو بے معنی قرار دیا۔

۱۹۳۰ء کی گول میز کانفرس میں مدراس کی مسز سبرا ائین اور لاہور کی بیگم جہاں آراء شاہنواز (دختر سر محمد شفیع) نے یہ میمورنڈم پیش کیا کہ انسانی حقوق کے سلسلے میں رنگ، نسل، جنس اور مذہب کی تمیز روا نہ رکھی جائے۔ تیسری گول میز کانفرس کے موقع پر آل انڈیا مسلم لیگ نے خواتین کے اس مطالبے کی پرزور حمایت کی' یہی وجہ تھی کہ جب گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ نافذ ہوا تو ساٹھ لاکھ عورتوں کو نہ صرف ووٹ کا حق ملا بلکہ کونسل آف سٹیٹ کی ۱۵۰ نشستوں میں سے چھ نشستیں عورتوں کیلئے مختص کی گئیں ان تمام کاوشوں میں مادر ملت بھرپور کردار ادا کرتی رہیں۔

مسلم لیگ کی عدم فعالیت، مسلم رہنماؤں کی اکثریت میں یقین اور سیاسی بصیرت کی کمی اور کانگریس کے معاندانہ رویہ نے قائداعظم کو برصغیر کے سیاسی حالات سے اس حد تک بیزار کردیا کہ انہوں نے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرلی اور لندن میں رہنے کا فیصلہ کرلیا۔ لندن قیام کے دوران محترمہ فاطمہ جناح کو سیاسی اسرار ورموز سے واقفیت حاصل ہوئی۔ آپ بہترین گھریلو منتظم تھیں، ضیافتوں کا انتظام، قائداعظم کی زیر ہدایت خود کرتی تھیں۔ قائداعظم کے مہمانوں میں برطانوی وزراء، ارکان پارلیمنٹ، مسلم

لیگی زعماء اور قانونی ماہرین شامل تھے۔ان سے گفتگو میں محترمہ فاطمہ جناح بھی شامل ہوتیں۔اس طرح انہیں آئندہ زندگی کے لیے بہترین سیاسی تربیت ملی۔وہ ایک شفیق و مہربان بہن کی حیثیت سے ان کی دیکھ بھال کرتیں۔کھانے،لکھنے پڑھنے و سیر کے اوقات،لوگوں سے میل ملاقات کا ایک مثالی شیڈول ترتیب دیا۔ جس کی پابندی پر قائداعظم بھی بعض اوقات نرم لہجے میں احتجاج کرتے۔قائداعظم کو سنبھالا دینے کے لیے ہمیں ان کی ذات کئی پرتوں میں ملفوف دکھائی دیتی ہے۔ان کی دیکھ بھال اور نگہداشت کے لیے وہ ماں کا روپ تھیں۔بابائے ملت کی دیکھ بھال انہوں نے ایک ذمہ دار اور فرمانبردار بیٹی کی طرح۔پبلک جلسوں میں ایک مددگار بھائی کی طرح ہوتیں۔سیاسی زندگی کی تنظیم میں بہترین رفیق کار اور مثالی مشیر،بیمار بھائی کے لیے بہترین نرس،پریشانیوں میں حوصلہ کا بلند و بالا مینار اور تنہائی کی مونس و غم خوار تھیں۔

قائداعظم کے قیام لندن کے فیصلہ سے سیاسی اور عوامی حلقوں میں بے چینی پھیل گئی۔اس موقع پر محترمہ فاطمہ جناح نے قائداعظم کو واپسی کی ترغیب دے کر بلاشبہ ایک اہم کارنامہ سرانجام دیا۔برصغیر کے دیگر مسلم زعماء علامہ محمد اقبال اور نوابزادہ لیاقت علی خان نے آپ سے برابر رابطہ رکھا اور ان کی واپسی کو ناگزیر قرار دیا لیکن محترمہ کی مشاورت نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔بالآخر قائداعظم محمد علی جناح محترمہ جناح کی معیت میں اکتوبر ۱۹۳۵ء میں وطن واپس آگئے،اور مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کا آغاز کیا۔اس سے پیشتر وہ ۱۹۳۴ء میں مسلم لیگ کی قیادت سنبھال چکے تھے۔

برصغیر آمد کے بعد قائداعظم کی صدارت میں مسلم لیگ نے فعال کردار ادا کرنا شروع کیا۔محترمہ فاطمہ جناح ان کے شانہ بشانہ تھیں۔۱۰ جولائی ۱۹۳۸ء کے اجلاس منعقدہ بمبئی میں ایک ویمن کمیٹی تشکیل دی گئی۔آپ کو اس کا رکن منتخب کیا گیا۔۱۹۳۹ء میں قائداعظم کے زیر صدارت اجلاس پٹنہ میں آل انڈیا مسلم لیگ ویمن برانچ کی ایک کمیٹی تشکیل کی گئی۔قائداعظم نے فاطمہ جناح کو اس کا کنوینر مقرر کیا۔اس اجلاس میں محترمہ فاطمہ جناح نے صدر مسلم لیگ سے باقاعدہ طور پر مطالبہ کیا کہ ورکنگ کمیٹی میں مسلم خواتین کو نمائندگی دی جائے۔۱۸ اکتوبر ۱۹۳۸ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کی صوبائی شاخ بمبئی مسلم لیگ کے زیر اہتمام سالانہ اجلاس میں برصغیر کی نمائندگی کے لیے تین خواتین کا انتخاب عمل میں لایا گیا۔بمبئی صوبہ کی نمائندگی مسز فاطمہ جناح،مسز فیض طیب جی اور بیگم حفیظ الدین کے حصہ میں آئی۔بعد ازاں محترمہ فاطمہ جناح نے برصغیر کی مسلم خواتین پر اپنے قول و عمل سے ثابت کر دیا کہ مسلم خواتین اپنی شاندار روایات ماضی کو ضرورت

پڑنے پر دہرانے کا فن جانتی ہیں۔ آپ مسلم خواتین کو بیدار کرنے اور تحریک پاکستان کو منظم خطوط پر جاری وساری رکھنے کے لیے مسلم لیگ کے ہر اہم اجلاس میں قائداعظم کے ساتھ رہیں۔ ملک بھر کے طوفانی دورے کیے، خواتین میں ایک نیا جوش اور تازہ ولولہ پیدا کیا۔ برصغیر کی معاشرتی روایات خواتین کو میدان سیاست میں آنے کی اجازت نہیں دیتی تھیں۔ لیکن آپ نے اس دشوار مرحلے کو بھی آسانی سے طے کرلیا، قائداعظم نے آپ کی خواہش پر بیگم مولانا محمد علی جوہر کو مسلم لیگ کی مجلس عاملہ (۱۹۳۸ء) میں شامل کیا۔ بیگم جوہر اجلاس میں نقاب اوڑھے شمولیت اختیار کرتیں، محترمہ فاطمہ جناح، اگرچہ نقاب نہ پہنتیں لیکن انہوں نے لباس کے معاملے میں اسلامی احکامات کو ہمیشہ مدنظر رکھا۔

۱۹۳۹ء میں مسلم لیگ خواتین سب کمیٹی کے تحت بلائے گئے بمبئی اجلاس میں فاطمہ جناح نے مسلم لیگ کے مسلم شعور کی بیداری کے ضمن میں کیے گئے اقدامات کے متعلق بتایا کہ مسلم لیگ نے ہندوستان کے کونے کونے سے مسلمانوں کو نہ صرف ایک پلیٹ فارم پر جمع کردیا بلکہ دو سال کے عرصے میں مسلمانوں میں بے مثال خود اعتمادی پیدا کردی ہے۔ اندرون اور بیرون ملک مسلمانوں کی نمائندہ جماعت بن کر سامنے آگئی ہے۔ قائداعظم کی ہمراہی میں آپ نے حصول پاکستان کے ضمن میں عورتوں کے سیاسی شعور کو بیدار کیا، مسلم خواتین کو پاکستان کا مفہوم سمجھایا اور بے شمار اجتماعات میں تقریریں کیں۔ دہلی کے ہر محلہ میں تین مہینے بعد بڑے پیمانے پر جلسہ کیا جاتا جہاں فاطمہ جناح خود تشریف لاتیں اور تنگ گلیوں میں پیدل چل کر جلسہ کی صدارت فرماتیں' آپ کے جلسوں میں بے پناہ ہجوم ہوتا اور ہر خاتون کی یہ خواہش اور کوشش ہوتی کہ وہ آپ سے مصافحہ کرے۔

بالآخر وہ لمحہ سعید آن پہنچا۔ جس کی مسلمانان برصغیر بڑے عرصے سے خواہش کرتے آرہے تھے، آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس لاہور ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء میں قرارداد پاکستان پیش ہونے والی تھی۔ مسلمانوں میں معمول سے زیادہ جوش وخروش دکھائی دے رہا تھا۔ خواتین نے اس اجلاس کی کامیابی کے لیے دن رات ایک کردیا۔ اپنی سرگرمیوں میں مہم کو تیز کردیا۔ محترمہ فاطمہ جناح شاخ کی ذیلی کمیٹی نے ایک الگ اجلاس منعقد کیا جس میں کم وبیش تین ہزار خواتین شریک ہوئیں۔ اس سے خواتین کی سیاسی بصیرت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ہر شخص ایک ہی مقصد کے لیے کام کررہا تھا اور قائداعظم سے دریافت کرتا تھا کہ وہ کیا کرے؟ ہر مرد وزن کو قائداعظم یہی جواب دیتے کہ جو جہاں ہے جس صوبے یا شہر قصبہ یا دیہات میں ہے وہاں رہ

کر کام کرے اس طرح سارے ہندوستان میں اپنے اپنے علاقوں کی نمائندہ خواتین مقرر کرلی گئیں۔ ان میں محترمہ فاطمہ جناح، بی اماں اور بیگم مولانا محمد علی کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ یہ خواتین جب اپنے اپنے مقامات پر واپس گئیں تو انہوں نے وہاں اجلاس منعقد کیے اور مقامی خواتین کو مسلمانان برصغیر کے الگ وطن کے مطالبے کے بارے میں آگاہ کیا اور خواتین میں آزادی کے حصول کے لئے زیادہ جوش وخروش اور ولولے سے کام کرنے کے لئے نئی جان ڈال دی۔ یہ حقیقت ہے کہ یہ اسی کمیٹی کا کارنامہ تھا کہ مسلم لیگ کا پیغام برصغیر کے کونے کونے میں اس کی اصل روح کے ساتھ پہنچ گیا۔ محترمہ اس سارے پس منظر میں ہراول دستے کی سالار کے طور پر سامنے آتی ہیں۔ عوام میں سیاسی، سماجی اور تعلیمی شعور کی بیداری کے عمل میں وہ قائداعظم کے ساتھ برابری کی سطح پر کھڑی نظر آتی ہیں۔ مئی ۱۹۴۱ء میں مدراس میں مسلم لیگ کا کل ہند اجلاس ہوا۔ خواتین کی ذیلی کمیٹی کی صدارت بیگم محمد علی نے کی۔ اس میں بیگم حسن آراء، بیگم محمد حسین، بیگم حسن آراء بیگم شریک ہوئیں۔

۱۹۴۱ء میں مسلم طالبات فیڈریشن کا قیام عمل میں آگیا تھا۔ اسی سال فیڈریشن نے ۲۳ مارچ کو یوم پاکستان منایا تھا۔ جس میں لاہور، علی گڑھ، لکھنؤ، ناگپور کی مسلم خواتین اور کالجوں کی طالبات نے شرکت کی تھی۔ اس سلسلے میں محترمہ فاطمہ جناح کے ایماء پر دہلی کے ایک کالج کی تین طالبات بیگم شائستہ اکرام اللہ سے دہلی میں ملیں اور مسلم طالبات فیڈریشن کے قیام کی درخواست کی۔ بیگم شائستہ نے ان طالبات کی ہمت افزائی کی اور اس کے بعد اسی سلسلے میں محترمہ فاطمہ جناح سے ملیں اور طالبات کی فیڈریشن کے قیام کیلئے ان سے طویل گفتگو کے بعد فیڈریشن کے قیام کا فیصلہ کرلیا۔ مسلم خواتین کی ایک کانفرنس طلب کی گئی۔ لاہور، علی گڑھ، لکھنؤ، میرٹھ، کلکتہ اور ناگپور کی مسلم زنانہ کالجوں کی طالبات کو شرکت کی دعوت دی گئی۔

۱۹۴۱ء میں مادر ملت کی کوششوں سے زنانہ نیشنل گارڈ کی تحریک بمبئی میں شروع ہوئی۔ خواتین کی اس میں شرکت دیدنی تھی۔ اسے مسلم لیگ خواتین کی سب سے کمیٹی کا حصہ بنایا گیا۔ فاطمہ جناح نے اگست ۱۹۴۳ء میں کوئٹہ کے مقام پر مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے خطاب کرتے ہوئے خواتین سے فرمایا کہ اب تک مسلم خواتین نے اپنی قوم کی خاص مدد نہیں کی۔ اگر ہم چاہتے تو بہت سا کام کیا جاسکتا تھا۔ اسوقت ہماری چار ضرورتیں واضح ہیں یعنی تعلیمی سیاسی معاشرتی اور اقتصادی۔ ہمیں اپنی قوت اور حیثیت کے مطابق اپنے خاندان، اپنے ہمسایہ، اپنے دوستوں اور عزیزوں میں عمل کی ایک نئی روح پھونک کر اس میں ایک نیا جذبہ پیدا

کرتا ہے۔ ۱۹۴۳ء میں محترمہ فاطمہ جناح نے مسلم خواتین کے کردار کو واضح کرتے ہوئے فرمایا:

"اس عظیم جدوجہد میں جس کا ہم کو اس وقت سامنا ہے اور جس سے ہمیں آئندہ گزرنا ہوگا۔ قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلم خواتین کو اس میں کیا حصہ لینا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ مجھ سے اتفاق کریں گی کہ مسلم ہندوستان کے بنانے میں ہمارے آگے وسیع میدان ہے اور ہم سب کا اس سے تعلق رکھنا اور اس میں حصہ ادا کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ یہ عورت کا ہاتھ ہے جو آج کے نوجوانوں اور کل کے بچوں کی زندگی کو سنوار سکتی ہے۔ یہ عورت ہی کا ہاتھ ہے جو عمدگی اور کامیابی کے ساتھ قومی ترجمانی کے ان شعبوں کو منظم کر سکتا ہے۔ جن کا تعلق عوام کی اقتصادی، سماجی اور تعلیمی سرگرمیوں سے ہو، آیئے سیاسی طور پر ہم کوشش کریں کہ آل انڈیا مسلم لیگ ہی مسلمانانِ ہند کی واحد مقتدر اور نمائندہ ادارہ ہے۔ ہم کوشش کریں گے کہ اپنے عوام میں اجتماعی اسپرٹ پیدا کریں۔"

محترمہ فاطمہ جناح نے عورتوں کے اندر موجزن جذبہ آزادی کو مہمیز کیا۔ یہ انہیں کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ خواتین کے مطالبے پر ۱۹۴۳ء میں خواتین کو آل انڈیا مسلم لیگ میں کل ہند کی بنیاد پر نمائندگی دی گئی۔ دہلی اجلاس میں ۱۹۴۳ء میں انہوں نے خواتین کو یقین دلایا کہ سیاسی عمل کی عارضی مشکلات ان کے جذبۂ حریت کو ختم نہیں کر سکتیں۔ ملکی تعمیر و ترقی میں ان کے سامنے وسیع مواقع موجود ہیں۔ انہوں نے یہ احساس اجاگر کیا کہ برصغیر کی عورت کسی سے کم نہیں خواتین کو تعلیم کے میدان میں حصہ لینا چاہیے۔

۱۹۴۳ء میں لاہور کے ضلعی انتخابات میں آل انڈیا مسلم لیگ نے کامیابی حاصل کر لی۔ محترمہ فاطمہ جناح نے اس مسرت کے موقع پر لاہور کا خیر سگالی دورہ کیا۔ اہلیان لاہور نے ان کا شاندار استقبال کیا۔ اس موقع پر آپ نے مسلم خواتین کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے فرمایا میں اپنی قوم کی بہنوں کو دلی مبارکباد دیتی ہوں جنہوں نے لاہور کی نشستیں جیت کر یہ ثابت کر دیا کہ پنجاب کے مسلمان سب کے سب پاکستان چاہتے ہیں۔

مادرِ ملت فاطمہ جناح نے جہاں برصغیر کے دیگر حصوں کی خواتین کو منظم کیا وہاں وہ کشمیری خواتین کو بھی آگے لانا چاہتی تھیں۔ قائداعظم کشمیر میں آخری بار ۱۹۴۴ء میں گئے تو محترمہ جناح بھی ان کے ہمراہ

تھیں۔ وہ کل چار مرتبہ کشمیر گئے جن میں سے دو مواقع پر فاطمہ جناح نے ان کا ساتھ دیا۔ قائداعظم کو اہل کشمیر سے بہت محبت تھی۔ باشندگان کشمیر بھی آپ کو والہانہ چاہتے تھے۔ مادر ملت کی بھی اہل کشمیر سے غایت درجہ محبت رہی۔ انہوں نے کمال محبت سے جموں و کشمیر کے دورے کیے۔ آپ نے مجاہدین کشمیر کے حوصلے بڑھائے۔ مہاجرین کی امداد و اعانت بھی کی۔ سیالکوٹ کے صوبائی مسلم لیگ کے تاریخی اجلاس سے فراغت کے بعد قائداعظم، حکومت کشمیر اور سیاسی لیڈروں کی دعوت پر ریاست جموں و کشمیر کے دورے پر روانہ ہوئے۔ قائداعظم اور ہمشیرہ قائداعظم کا شاندار استقبال کیا گیا۔ محترمہ فاطمہ جناح کو الگ کار میں قائداعظم کی قیام گاہ ڈاک بنگلہ جموں بھیج دیا گیا۔ جہاں آپ نے خواتین کو شرف باریابی بخشا۔ دوسرے روز وہ سرینگر روانہ ہو گئے۔ سرینگر میں اپنے قیام کے دوران مادر ملت نے مسلم خواتین سے رابطہ قائم کیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے مسلم کانفرنس کے جنرل سیکریٹری کی والدہ ماجدہ (جو ایک ماہر تعلیم تھیں) اور ان کی اہلیہ سے ملاقات کی اور کشمیری خواتین کو تحریک پاکستان میں شمولیت کی دعوت دی۔

بعد ازاں جب ۱۹۴۷ء میں جنگ آزادی کشمیر کا آغاز ہوا تو محترمہ فاطمہ جناح نے کشمیر فنڈ قائم کیا اور اس سے کشمیری مجاہدین کی مالی امداد کی آپ خود بھی محاذ پر تشریف لے گئیں اور مجاہدین کی حوصلہ افزائی کی۔ مہاجرین کے کیمپوں کا دورہ بھی کیا اور ان کی قربانی اور خدمات کو سراہا۔

آزادی کی منزل اب زیادہ دور نہیں تھی۔ پاکستان کا حصول بہت واضح ہو چکا تھا، انگریزوں کی طاقت کا شیرازہ دوسری جنگ عظیم کے بعد بکھر چکا تھا۔ برطانیہ کا اقتصادی طور پر دیوالیہ نکل چکا تھا۔ وہ اب برصغیر سے نکلنے کے چکر میں تھا۔ ہندوستان میں قومی آزادی کی تحریک انگریز کے بس سے باہر دکھائی دیتی تھی۔ ان حالات میں مسلم خواتین سر پر کفن باندھ کر میدان عمل میں کود چکی تھیں۔ کل ہند خواتین مسلم لیگ کے پرچم تلے جمع ہو کر انہوں نے اپنی محنت سے ثابت کر دیا تھا کہ اگر موقع دیا جائے تو مسلمان خواتین دنیا کی دوسری خواتین سے پیچھے نہیں ہیں ادھر قائداعظم کی مصروفیات بڑھتی جا رہی تھیں اس وجہ سے انہوں نے خواتین کے کاموں کا جائزہ لینے کے لئے اپنی ہمشیرہ فاطمہ جناح کو مقرر کر دیا۔ محترمہ فاطمہ جناح نے قائداعظم کا پورا پورا ساتھ دیا اور کوئٹہ، دہلی اور دور دراز کے علاقوں کی عورتوں کو جگایا۔ لیکن جب بھی قائداعظم کو وقت ملتا وہ خواتین کے وفود سے ملاقات کرتے۔ انکو اپنے مشوروں سے نوازتے اور ان کی ہمت افزائی کرتے جہاں ضروری سمجھتے خود خواتین کے اجلاس سے خطاب کرتے۔

۱۹۴۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر قائداعظم محمد علی جناح نے نو منتخب ممبران اسمبلی کا کنونشن منعقد کیا۔ سارے ہندوستان میں مسلم لیگ نے تقریباً ۹۰ فیصد سے زیادہ مسلم نشستوں پر کانگریس کو شکست دی۔ اگرچہ خواتین کی نشستیں بہت کم تھیں لیکن عورتوں کا کردار نا قابل فراموش تھا۔ ۷، ۸، ۱۰ اپریل ۱۹۴۶ء کو اینگلو عربک کالج دہلی میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ کنونشن منعقد ہوا۔ عورتوں کی خصوصی نشستوں کا بندوبست کیا گیا۔ پہلے سیشن کی صدارت قائداعظم محمد علی جناح نے کی، محترمہ فاطمہ جناح ان کے ہمراہ تھیں۔ ان کے علاوہ بیگم محمد علی جوہر، بیگم شاہنواز، بیگم ایاز رسول بھی موجود تھیں۔ نوابزادہ لیاقت علی خان سیکرٹری کی نشست سنبھالے ہوئے تھے۔ تمام خواتین نے اپنی تقاریر میں قائداعظم کی قیادت پر یقین اور اپنے مضبوط ارادوں کا ذکر کیا۔ آخری سیشن میں قائداعظم نے خطاب کیا اور زری سرفراز کی قیادت میں سرحد کی عورتوں کے وفد نے قائداعظم سے ملاقات کی۔

صوبہ سرحد میں کانگریس کی وزارت تھی، ڈاکٹر خان وزیر اعلیٰ تھے۔ کانگریس نے سرحد اسمبلی میں ۳۸ میں سے ۲۱ نشستیں حاصل کی تھیں۔ اور ۱۷ نشستیں مسلم لیگ کو حاصل ہوئیں۔ ڈاکٹر خان نے الیکشن میں ہند و رہنما لیڈر داس سے مل کر انتخابات کو متاثر کیا تھا۔ کانگریس حکومت نے مسلمانوں پر ظلم کی انتہا کر دی۔ اکثر مسلم لیگی رہنما اور کارکن جیلوں میں بند کر دیے گئے۔ بڑے جلسوں جلوسوں کا اہتمام کیا گیا۔ ۱۳ مارچ ۱۹۴۷ء کو بیگم کمال الدین کی قیادت میں عورتوں کا جلوس نکالا، لاٹھی چارج اور آنسو گیس کا سامنا کیا۔ خواتین، پشاور ریلوے اسٹیشن پر بمبئی ایکسپریس کے آگے لیٹ گئیں اس سانحہ میں ۴۶ سے زائد خواتین شدید زخمی ہوئیں کئی ایک کی پسلیاں ٹوٹ گئیں۔ بیگم نذیر نیاز حسن آرا نے سیکرٹریٹ پشاور سے یونین جیک اتار کر مسلم لیگ کا جھنڈا لہرا دیا۔

قائداعظم، مسلم لیگ اور پوری ملت اسلامیہ ہند کا فیصلہ یہ تھا کہ مطالبہ پاکستان کے سوائے کوئی حل قابل قبول نہیں۔ دوسری طرف لارڈ ماؤنٹ بیٹن اس بات پر مصر تھے کہ ہندوستان تقسیم نہ ہو بلکہ اسے جغرافیائی وحدت کے طور پر ہی برقرار رکھا جائے۔ ۵ تا ۱۰ اپریل ۱۹۴۷ء دونوں رہنماؤں نے ملاقات کی اور مشاورت جاری رکھی۔ ماؤنٹ بیٹن یک نکاتی ایجنڈا لے کر آیا تھا اور قائداعظم سے یہ منوانا چاہتا تھا کہ جناح کابینہ مشن پلان کے تحت، ہندوستان کی وفاق کے تحت خودمختاری کو قبول کر لیں اور مطالبہ پاکستان کی تکرار سے ہٹ جائیں۔ وائسرائے لاج میں قائداعظم اور محترمہ فاطمہ جناح کو مدعو کیا گیا۔ تبادلہ خیالات ہوا مگر

دونوں اپنے نظریات کو چھوڑنے پر تیار نہ ہوئے۔ بقول لارڈ ماؤنٹ بیٹن:

''نہ تو میری بیوی، نہ بیٹی اور نہ میں جناح اور فاطمہ جناح کو مطالبہ پاکستان سے ہٹانے پر قائل کر سکے''۔

جس روز تین جون ۱۹۴۷ء کو تقسیم ہند کا اعلان ہوا قائداعظم نے آل انڈیا ریڈیو سے پہلی بار پاکستان زندہ آباد کہا۔ دوسری صبح نورالصباح بیگم کے ہمراہ دہلی مسلم لیگ خواتین قائداعظم کی خدمت میں نذرانہ عقیدت پیش کرنے ۱۰۔ اورنگ زیب روڈ پہنچیں تو کوئی پندرہ ہزار خواتین کا جلوس ان کے ہمراہ تھا۔ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ قائداعظم محترمہ فاطمہ جناح کو ساتھ لے کر باہر لان میں آئے، پاکستان زندہ آباد کے فلک شگاف نعرے لگ رہے تھے۔ دہلی کی خواتین نے ایک دوسرے سے آگے بڑھ کر قائداعظم کے گلے میں پھولوں کے گجرے اور ہار ڈالے۔ محبت کرنے والی بہن فاطمہ جناح، بھائی کے گلے کو پھولوں سے آزاد کرنے کے لیے ہار اتار کر ملازم کو پکڑاتیں۔

مسلم لیگ کے سربراہ نے مسلم عوام کی تائید اور قوت ارادی کی بناء پر دنیا کے نقشے کو بدل دیا۔ ہر مذہب کے لئے پاکستان آشیانہ بن گیا۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو وہ بہت خوش تھے۔ چنڈال کی طرف جاتے ہوئے وائسرائے ہند لارڈ لوئس ماؤنٹ بیٹن نے کہا۔

''مسٹر جناح خفیہ اداروں کی رپورٹ ہے کہ باہر نہ جائیں آپ کی جان کو خطرہ ہے آپ پر قاتلانہ حملہ ہو جائے گا''

مسٹر جناح نے کہا: ''آج بڑی مسرت کا دن ہے۔ مجھے کچھ نہیں ہوتا میرا خدا حافظ ہے''
اس نازک اور جان لیوا جلوس میں فاطمہ جناح ہمراہ تھیں۔

جب پاکستان معرض وجود میں آیا تو کثیر تعداد میں مہاجر اپنا وطن چھوڑ کر قتل و غارت سے بچ کر کراچی آئے' مادر ملت نے ۱۳ ستمبر ۱۹۴۷ء کو اپنی رہائش گاہ پر مہاجرین کی امداد کیلئے کمیٹی بنائی۔ آپ نے پنجاب کے مہاجرین کے لئے مشرقی پنجاب مصیبت زدگان کیلئے ۳۰ ہزار روپیہ بھجوایا' ریلیف کمیٹی نے ایک لاکھ چھتیس ہزار روپے اکٹھے کیے۔ ۲۵ نومبر ۱۹۴۷ء کو محترمہ فاطمہ جناح لاہور آئیں اور ریڈیو پاکستان لاہور سے خطاب کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ

''میں نے لاہور آ کر کیمپوں کا معائنہ کیا جہاں مہاجرین ہیں۔ ہسپتالوں اور زنانہ دست

کاری مراکز کا معائنہ کیا۔ تکالیف بہت ہیں۔ بے شمار دل ہلا دینے والی کہانیاں ہیں۔
ان لوگوں پر بڑی مصیبت آئی ہے۔ ہم اپنی مملکت کی تاریخ کے نئے دور سے گزر رہے
ہیں۔ آیئے ہم عہد کریں کہ اس مملکت کی بقا کے لئے کوئی کسر نہ چھوڑیں گے۔"

۳۰ اگست ۱۹۴۷ء کو عوام سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"ہم نے اپنی منزل پا لی ہے اور ایک آزاد خود مختار اور دنیا کی پانچویں بڑی مملکت قائم ہو چکی
ہے۔ ہم بے شمار ناگفتہ بہ مصائب میں گھرے ہوئے ہیں۔ خدا پر بھروسہ رکھیے اس دنیا میں
کوئی ایسی طاقت موجود نہیں جو پاکستان کو مٹا سکے۔ یہ قائم رہنے کیلئے بنا ہے۔ ہمارا عمل دنیا
میں ثابت کر رہا ہے کہ ہم حق پر ہیں۔"

محترمہ فاطمہ جناح نے فروری ۱۹۴۸ء میں انڈسٹریل ہوم کراچی کا افتتاح کیا۔ اگلے مہینے وہ
قائداعظم کے ہمراہ مشرقی پاکستان کے دورہ پر چلی گئیں۔ (۵۱) مارچ ۱۹۴۸ء میں قائداعظم بذریعہ جہاز
ڈھاکہ پہنچے اور بے شمار مقامات پر مشرقی پاکستان میں خطاب کیا اور ان سب مواقع پر محترمہ فاطمہ جناح
ساتھ تھیں۔ ۲۱ مارچ کو ڈھاکہ میں ایک جلسہ عام سے خطاب کیا۔ یہ ایک لمبی تقریر تھی جس کے دوران آپ
نے تین بار پاکستان زندہ باد کہا۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد سے ۲۴ مارچ کو خطاب کیا۔ گزیٹڈ
افسران سے خطاب ۲۵ مارچ ۱۹۴۸ء کو چٹاگانگ میں کیا ' ۲۸ مارچ کو ریڈیو پاکستان ڈھاکہ سے خطاب کیا۔

۲۰ اپریل ۱۹۴۸ء کو پشاور میں جلسہ عام سے خطاب کیا ' بارش کے باوجود اپنی جگہ سے نہ ہلے۔
عوام کے جذبات کا پاس رکھتے ہوئے ٹھنڈ میں بیٹھے رہے۔ پھیپھڑوں میں سوزش ہو گئی۔

فاطمہ جناح ہمراہ تھیں ' انہوں نے دوران سفر آپ کا ہر لحظہ خیال رکھا۔ جس کا قائداعظم نے خود اعتراف کیا:

"فاطمہ جناح کا مجھ پر بڑا احسان ہے ' انہوں نے میری دیکھ بھال کی اور ہر تحریک
اور سیاسی سرگرمیوں میں میرا ساتھ دیا۔ طویل عرصے تک میری خدمت کی اور مسلم
خواتین کو بیدار کر کے مجھ پر احسان کیا ہے۔"

قائداعظم کی جدوجہد مثالی ' قوت ارادی ناقابل شکست عزائم کی بلندی ہمالیہ سے بھی اونچی تھی۔ انہوں نے
انتہائی نامساعد حالات میں تاریخ ساز کردار ادا کیا۔ حکومت وقت کا معاندانہ رویہ ' ہندو اور غیر کانگریس
رہنماؤں کی واضح مخالفت ' کانگریسی لیڈروں کی سیاسی حکمت عملی اور سب سے بڑھ کر مسلم قوم کی بے حسی '

علاوہ کانگریس کی مخالفت' جاگیرداروں کی ملت فروشی' ان تمام حالات و واقعات نے محمد علی جناح کو نڈھال اور مضمحل کر دیا۔ ستم بالائے ستم خرابی صحت نے ان کے قوائے عمل کو مضمحل کر دیا۔ ان کٹھن' دشوار اور نامساعد حالات میں صرف بقول جناح فاطمہ جناح امید کی کرن تھی جو تیماردار بھی تھی' سیاسی مشیر بھی تھی' خانہ داری کے امور کی نگران بھی تھی۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اس تاریخ ساز جدوجہد میں مسلم قوم کی قیادت کرنے والی شخصیت محمد علی جناح کی معاونت کرنے والی' ان کے مسائل کو سمجھنے والی' نامساعد حالات میں کٹھن دور کرنے والی ایک ہی ذات تھی اور وہ محترمہ فاطمہ جناح تھیں۔

حوالہ جات

۱۔ صفدر محمود ڈاکٹر' تقسیم ہند افسانہ اور حقیقت' جنگ پبلشرز لاہور'

۲۔ Akber, S. Ahmad, Muslim Heroes, OUP, London 1997,

۳۔ حسین ہمدانی' آغا' فاطمہ جناح حیات و خدمات' قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت اسلام آباد ۱۹۸۹ء

۴۔ ایم اے صوفی' پروفیسر ڈاکٹر' مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح حیات و افکار علم و عرفان پبلشرز لاہور

۵۔ تسکین قمر' قائداعظم محمد علی جناح مکتوب پبلشرز لاہور ۱۹۸۹ء

۶۔ عزیز قطب الدین' مادر ملت قائداعظم کی دست راست' روزنامہ جنگ لندن' ۱۲ جولائی ۲۰۰۳ء

۷۔ نور الصباح بیگم تحریک پاکستان اور خواتین' شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۷۱ء'

۸۔ Dr. Miss Kaniz Fatima, Dr. M.Saleem Akhtar, Dr.Razi Wasti
Pakistan Resoulation Revisited, Islamabad, N.I.H.C.R, 1990,

۹۔ Dr. Riaz Ahmed, Mohtrama Fatima Jinnah, a chronology (1893-1967)

۱۰۔ محمود ہاشمی' ڈاکٹر' قائداعظم محمد علی جناح اور خواتین قیادت' مجلہ تاریخ و ثقافت پاکستان' قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت اسلام آباد' اکتوبر ۲۰۰۱ء

۱۱۔ بیگم سیدہ عابدہ ریاست رضوی مضمون تحریک پاکستان میں خواتین کا کردار علم کی روشنی' سال قائداعظم' جلد ۳' شمارہ ۲' علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی' اسلام آباد ۲۰۰۱ء

۱۲۔ عزیز جاوید' پاکستان کی نامور خواتین' پشاور ۱۹۶۳ء

۱۳۔ گل بانگ حیات' فیروز سنز لاہور

۱۴۔ ثریا خورشید' مقالہ محترمہ فاطمہ جناح اور کشمیر' کارروائی مادر ملت کانفرنس' ادارہ تحقیق تاریخ و ثقافت اسلام آباد' منعقدہ ۲۶ جون ۲۰۰۳ء

۱۵۔ آفتاب احمد' چند یادیں چند ملاقاتیں' ۲۰' ۱۹۶۷ء

محمد عمران ہاشمی

اقبال اور اتحادِ بین المسلمین

ملت اسلامیہ کے باہمی اتحاد و یگانگت کی اہمیت کو ہر دور میں محسوس کیا جاتا رہا ہے لیکن اس کی جس قدر اہمیت و ضرورت آج ہے شاید اس سے پہلے کبھی اتنی نہ تھی۔ ہماری داخلی کمزوریوں اور مغربی اقوام کی ریشہ دوانیوں، جارحیت اور اسلام دشمنی کے نتیجے کے طور پر امت مسلمہ زوال، انحطاط اور انتشار کا شکار رہی ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہو چکی ہے۔ مخالف مغربی قوتیں یہ نہیں چاہتیں کہ اسے اپنی ملی خودی کا شعور ہو وہ اس میں انتشار پیدا کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتیں اور مختلف حیلوں بہانوں سے جارحانہ مداخلت کر کے عالم اسلام کو ایک دوسرے کے خلاف صف آرا رکھنے میں مصروف عمل ہیں۔ کہیں لسانی، نسلی، علاقائی، تمدنی اور ثقافتی عصبیتوں کا زہر پھیلانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں تو کہیں مذہبی فرقہ بندیوں، اقتصادی الجھنوں اور سیاسی محاذ آرائیوں کے جال میں پھنسایا جا رہا ہے تا کہ مسلمانوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا جائے اور انہیں متحد نہ ہونے دیا جائے۔ علامہ ان مغربی ہتھکنڈوں کو سمجھتے تھے۔

حکمت مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز

نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات ☆

اقبال نے اس نکتے کو واضح کیا ہے کہ مسلمانوں کی ملت اور قومیت کی بنیاد روحانی اور دینی ہے۔ ملتِ اسلامیہ ایمان و عقیدہ اور نظام حیات کی وجہ سے زمان و مکان کی حدود و قیود سے آزاد ہے یہ کسی ملک، سرزمین پر انحصار نہیں کرتی اس لئے ملکی حدود کی تبدیلی، سیاسی عروج و زوال اور فتح و شکست اسے متاثر نہیں کر سکتے لہٰذا فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ دین کا دامن مضبوطی سے تھامے رہیں۔

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

☆ بانگ درا ص ۲۶۲، ۲۶۳ ص ۲۶۲

نسل پرستی، وطنیت اور قومیت بیا ایسے امراض ہیں جن سے کوئی قوم معاشی پسماندگی، سیاسی ابتری اور اخلاقی بے راہ روی کا شکار ہو جاتی ہے چنانچہ علامہ بار بار تلقین کرتے ہیں کہ مسلمان اخوت، حریت اور مساوات کے اصولوں پر گامزن ہوں، اسلامی عقائد کے تقاضوں پر متوجہ ہوں۔ اسلام کی سطح پر متحد اور متفق ہوں۔ اسی میں ان کی فلاح مضمر ہے۔

ربط و ضبط ملتِ بیضا ہے مشرق کی نجات — ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے — نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر
جو کرے گا امتیاز رنگ و بو مٹ جائے گا — ترک خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی — اڑ گیا دنیا سے تو مانندِ خاکِ رہگذر

یہی مقصود فطرت ہے یہی رمز مسلمانی — اخوت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی
بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا — نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو — اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے — تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

نہ افغانیم نے ترک و تتاریم — چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیزِ رنگ و بو بر ما حرام است — کہ ما پروردۂ یک نو بہاریم

مزید فرماتے ہیں:

ہے زندہ فقط وحدتِ افکار سے ملت — وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد
وحدت کی حفاظت نہیں بے قوتِ بازو — آتی نہیں کچھ کام یہاں عقلِ خداداد

علامہ یہاں دو طرح کی وحدت اور یکجہتی کا درس دیتے ہیں ایک ملکی سطح پر کہ مسلمان علاقائی، ذات پات، برادریوں اور لسانی حدود سے آزاد ہوں اور دوسرے عالمی سطح پر کہ پوری دنیا کے مسلمان ممالک آپس میں اتحاد قائم کریں۔ علامہ اس ساری صورت حال کو حکیم کی دقیقہ رس نگاہوں سے دیکھ رہے تھے اور ان کے شعور و بصیرت پر یہ بات پوری طرح واضح تھی کہ ملتِ اسلامیہ کی تنظیم و بقا اور استحکام باہمی اتحاد و یگانگت کے بغیر ممکن نہیں اور اس اتحاد کی بنیاد صرف مذہب ہے اور اگر مسلمانوں نے مذہب کو پس پشت ڈال دیا تو وہ

اپنی تنظیم بقا اور استحکام سے بے نیاز ہو جائیں گے۔ جس سے عالم اسلام کو کتنا نقصان پہنچے گا۔ علامہ اسے کس طرح سوچتے ہیں:

ما مسلمانیم و اولاد خلیل　　از "ابیکم" گیر اگر خواہی دلیل
با وطن وابستہ -- تقدیر اُمم　　بر نسب بنیاد -- تعمیر اُمم
اصل ملت در وطن دیدن کہ چہ　　باد و آب و گل پرستیدن کہ چہ
بر نسب نازاں شدن نادانی است　　حکم او اندر تن و تن فانی است
ملتِ ما را --- اساس دیگر است　　ایں اساس اندر دل ما مضمر است
حاضریم و دل بغائب بستہ ایم　　پس ز بند این و آں وارستہ ایم
رشتۂ این قوم مثل --- انجم است　　چوں نگہ ہم از نگاہ ما گم است
تیر خوش پیکان یک کیشیم ما　　یک نما یک بیں یک اندیشیم ما☆

یعنی مسلمانانِ عالم کے اتحاد کی بنیاد وطنیت کی محدود مادہ پرستی پر قائم نہیں ہے بلکہ اسلام کے پیش کردہ نظریہ توحید، وحدت، مساواتِ انسانی، عقیدۂ رسالت اور اخوت و باہمی الفت پر ہے۔

ملتِ چنا تن و جاں لا الہ　　ساز ما را پردہ گرداں لا الہ
اسود از توحید احمر می شود　　خویش فاروقؓ و ابوذرؓ می شود☆☆

علامہ سمجھتے تھے کہ امتِ مسلمہ کے اتحاد کی بنیاد نہ مادہ پرستی ہے اور نہ ہی نگاہوں کو خیرہ کر دینے والی دنیائے مغرب کی چمک دمک بلکہ خالص توحید و رسالت ہی اس کا واحد راستہ ہے اور اس عقیدہ میں لازم ہے کہ مسلمان فکر کے ساتھ ساتھ عملی اعتبار سے بھی متحد ہوں اور ملتِ اسلام کے اتحاد کی طرف پیش قدمی کریں۔

منفعت ایک ہے اس قوم کی، نقصان بھی ایک　　ایک ہی سب کا نبیؐ، دین بھی، ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک　　کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں　　کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں☆☆
زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی　　آج کیا ہے فقط ایک مسئلۂ علم کلام
میں نے اے میر سپہ تیری سپہ دیکھی ہے　　قل ھو اللہ کی شمشیر سے خالی ہے نیام

☆ اسرار و رموز ص ۲۱۲　☆☆ اسرار و رموز ص ۲۱۰۰　☆☆☆ بانگ درا ص ۲۰۲

علامہ توحید کے بعد ملت اسلامیہ کے اتحاد کیلئے دوسرا روحانی عنصر رسالت کی مخصوص صورت (ختم نبوت) کو قرار دیتے ہیں کہ عشق رسولؐ ہی مسلمانوں کے اتحاد اور ان کے ارتقاء کا موجب ہے۔

حق تعالیٰ پیکر ما آفرید ——— وز رسالت در تن ما جاں دمید

نظم "جواب شکوہ" کے آخری چار بند میں بھی علامہ عشق رسولؐ ہی کو مسلم امہ کے اتحاد کا موجب سمجھتے ہیں۔

مثل بو قید ہے غنچے میں، پریشاں ہو جا ——— رخت بردوش ہوائے چمنستاں ہو جا

ہے تنک مایہ تو ذرے سے بیاباں ہو جا ——— نغمہ موج سے ہنگامہ طوفاں --- ہو جا

قوت عشق سے ہر پست کو بالا کر دے ——— دہر میں اسم محمدؐ سے اجالا کر دے

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو ——— چمن دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو

یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو خم بھی نہ ہو ——— بزم توحید بھی دنیا میں نہ ہو تم بھی نہ ہو

خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے ——— نبض ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

دشت میں دامن کہسار میں میدان میں ہے ——— بحر میں موج کی آغوش میں طوفان میں ہے

چین کے شہر مراقش کے بیابان میں ہے ——— اور پوشیدہ مسلمان کے ایمان میں ہے

چشم اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے ——— رفعت شان رفعنا لک ذکرک دیکھے

مردم چشم زمیں یعنی وہ کالی دنیا ——— وہ تمہارے شہدا پالنے والی دنیا

گرمی مہر کی پروردہ ہلالی دنیا ——— عشق والے جسے کہتے ہیں بلالی دنیا

تپش اندوز ہے اس نام سے پارے کی طرح ——— غوطہ زن نور میں ہے آنکھ کے تارے کی طرح

عقل ہے تیری سپر عشق ہے شمشیر تری ——— مرے درویش! خلافت ہے جہانگیر تری

ماسوا اللہ کے لئے آگ ہے تکبیر تری ——— تو مسلماں ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں ——— یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

علامہ نے جہاں اپنی شاعری میں اتحاد ملت کے موضوع کو بڑی صراحت و وضاحت سے بیان کیا ہے وہاں اپنے خطبات اور نثری تحریروں میں بھی اتحاد مسلمین کو مرکزی حیثیت دی ہے وہ مسلم امہ کے بگڑے ہوئے حالات اور زوال پذیر معاشی و معاشرتی مسائل کے علاوہ تہذیبی اور روحانی بے چارگی پر بھی ہمیشہ ملول و

رنجیدہ ورہے۔ لکھتے ہیں:

"یہ بدنصیب قوم حکومت کھو بیٹھی ہے، تجارت کھو بیٹھی ہے، صنعت کھو بیٹھی ہے۔ اب وقت کے تقاضوں سے غافل اور افلاس کی تیز تلوار سے مجروح ہو کر ایک بے معنی توکل کا عصا ٹیکے کھڑی ہے۔ اور باتیں تو خیر۔ ابھی تک اس کی مذہبی نزاعوں ہی کا فیصلہ نہیں ہوا۔ آئے دن ایک نیا فرقہ پیدا ہوتا ہے جو اپنے آپ کو جنت کا وارث سمجھ کر باقی نوع انسانی کو جہنم کا ایندھن قرار دیتا ہے۔ غرضیکہ ان فرقہ آرائیوں نے خیر الامم کی جمعیت کو کچھ ایسی بری طرح منتشر کر دیا ہے کہ اتحاد و یگانگت کی کوئی صورت نظر نہیں آتی"۔ ☆

علامہ اپنی حکیمانہ ژرف نگاہی سے ان گتھیوں کو سلجھاتے ہیں۔ سید سلیمان ندوی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"اس وقت مذہبی اعتبار سے دنیائے اسلام کو راہنمائی کی سخت ضرورت ہے۔ سیاسی اعتبار سے تو ہم باقی اقوام اسلامیہ کو ایسی کوئی مدد نہیں دے سکتے۔ البتہ دماغی اعتبار سے ان کیلئے بہت کچھ کیا جاسکتا ہے"۔ ☆☆

مزید فرماتے ہیں:

میں نہ عارف، نہ مجدد، نہ محدث، نہ فقیہ مجھ کو معلوم نہیں کیا ہے نبوت کا مقام
ہاں مگر عالم اسلام پہ رکھتا ہوں نظر فاش ہے مجھ پہ ضمیر فلک نیلی فام
عصر حاضر کی شب تار میں دیکھی میں نے یہ حقیقت کہ ہے روشن صفت ماہ تمام
وہ نبوت ہے مسلماں کے لئے برگ حشیش جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام ☆☆☆

علامہ مسلم امہ کو مغربی اقوام پر تکیہ کرنے کی بجائے متحد ہونے اور اپنے آپ کو اس قابل بنانے کی تلقین کرتے ہیں کہ وہ خود اپنے مسائل آپ حل کریں۔

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدت آدم
تفریق ملل حکمت افرنگ کا مقصود اسلام کا مقصود فقط ملت آدم
مکہ نے دیا خاک جنیوا کو یہ پیغام جمعیت اقوام کہ جمعیت آدم ☆☆☆☆

علامہ کے نزدیک مغربی اقوام کی استعماریت اور جارحیت کے تدارک کی ایک ہی صورت نظر آتی ہے کہ امت مسلمہ کا آپس میں اتحاد ہو۔ یہ اتحاد سیاسیات کی حد تک تو ٹھیک ہے لیکن نسلی یا جغرافیائی بنیادوں پر درست و کامیاب نہیں ہو سکتا۔ یہاں اقبال عالم اسلام کے ایک مرکز کا تصور بھی پیش کرتے ہیں اور یہ مرکز

☆ مقالات اقبال ص ۵۱-۵۲ ☆☆ اقبال نامہ ☆☆☆ ضرب کلیم ☆☆☆☆ ضرب کلیم ص ۵۷-۵۸

بنیادی طور پر مذہبی اور تمدنی ہے' سیاسی نہیں جسے وہ کعبہ قرار دیتے ہیں اور اس مرکز کو ناگزیر قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس سے اجتماعی وحدت برقرار رہتی ہے اور تمدن میں یکسانیت پیدا ہوتی ہے۔

ہم چناں آئین میلاد اُمم ___ زندگی بر مرکزے آید بہم
حلقہ را مرکز چو جاں در پیکر است ___ خطِ اُو در نقطۂ او مضمر است
قوم را ربط و نظام از مرکزے ___ روزگارش را دوام از مرکزے
راز دارو رازِ ما بیت الحرم ___ سوزِ ما ہم سازِ ما بیت الحرم
توز پیوند حریمے زندۂ ___ تا طواف اُو کنی پائندہ ☆

حرم جز قبلۂ قلب ونظر نیست ___ طواف او طواف بام و در نیست
میانِ ما و بیت اللہ رمزیست ___ کہ جبریل امیں راہم خبر نیست

قوموں کیلئے موت ہے مرکز سے جدائی ___ ہو صاحب مرکز تو خودی کیا ہے خدائی

اتحاد عالم اسلامی کی تحریک جو جمال الدین افغانی اور محمد عبدہ کے فکر و عمل سے سیراب ہوئی تھی اور جسے سید احمد خاں' شبلی نعمانی' الطاف حسین حالی' ابوالکلام آزاد اور دیگر زعماء نے اپنے تعلیمی اور مذہبی نظریات سے آگے بڑھا کر گراں قدر خدمات انجام دیں اور یہ چاہا کہ ملت اسلامیہ کو ایک فعال اجتماعیت کے سانچے میں ڈھالا جائے۔ اسی سلسلے کو علامہؒ نے بڑی صراحت اور وضاحت سے اپنا مطمع نظر بنایا اور اتحاد بین المسلمین کو اپنی شاعری اور نثری تحریروں میں مرکزی نکتہ قرار دیا۔ آج جو ہم ان بیرونی طاقتوں کے تسلط اور مسلم ممالک کے آپس کے جھگڑوں کی وجہ سے ضائع ہو رہے اور ہر لحاظ سے پس ماندہ ہو چکے ہیں۔ اگر اب بھی علامہ کے افکار و نظریات پر عمل پیرا ہوں' اسلام و شریعت محمدیؐ پر متحد ہو کر باطل قوتوں کے پیدا کردہ ان اتھاہ اندھیروں سے نکل سکتے ہیں اور اپنے وجود کی معنویت اور غایت کی تکمیل میں مدد دیکر کرۂ ارض پر امت مسلمہ کو ایک عظیم قوت بنا سکتے ہیں۔

☆ اسرار و رموز ص ۱۹۸

Largest Exploration
Production
Portfolio
Leading the Way
Oil & Gas Development
Company Ltd.

محمد شفیع عارف دہلوی

مولانا صوفی عبدالسلام نیازیؒ

بیسویں صدی کے سب سے بڑے عالم دین اور صوفی جن کے ہاتھ پر ۳۶ ہزار افراد نے اسلام قبول کیا اور جن سے سید ابوالاعلیٰ مودودی نے عربی کے علاوہ فلسفہ، منطق، علم کلام اور فن استدلال کی تعلیم حاصل کی۔

دنیائے اسلام میں یوں تو ہر دور میں بڑی بڑی قابل قدر اور لائق ستائش ہستیاں پیدا ہوتی رہی ہیں مگر گزشتہ ڈیڑھ صدی میں برصغیر ہند و پاک میں ایک ایسی عظیم اور نادر روزگار ہستی جسے آپ نازش دانش و بینش جمال آدمیت، شمع عرفان و آگہی جو کچھ بھی فرمائیں زیب دیتا ہے جسکا ہم پلہ و ہمسر عرب و عجم میں کوئی نہیں تھا۔ اس قابل صد افتخار اور یگانہ روزگار ہستی کا نام صوفی عبدالسلام نیازی (مرحوم و مغفور) ہے۔ اس شخص کی علمیت، کمال فضل اور جامعیت کے اظہار کے لئے اتنا ہی کہنا بہت کافی ہے کہ سید ابوالاعلیٰ مودودی جو عالم اسلام بذات خود ایک جید عالم تسلیم کیے جاتے تھے اور جن کی بیشمار بیش بہا تصانیف آج بھی مختلف دار العلوم میں پڑھائی جاتی ہیں بڑے فخر سے فرماتے تھے کہ میں نے عربی زبان، فلسفہ، منطق، علم کلام اور فن استدلال کی تعلیم مولانا عبدالسلام نیازیؒ سے حاصل کی ہے۔ جنکی ہستی اپنے دور میں بیک وقت اتنے بہت سے علوم کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھی جسکی مثال دور دور تک نہیں ملتی تھی۔ خود مولانا نیازی فرمایا کرتے تھے کہ میرے اصل شاگرد ڈھائی ہیں۔ (۱) سید ابوالخیر مودودی (۲) سید ابوالاعلیٰ مودودی اور نصف ایک اور صاحب تھے جنکا نام موصوف نے ظاہر نہیں فرمایا۔

مگر یہ امر واقعی قابل افسوس ہے کہ ایک ایسی عظیم ہستی اور بزرگ شخصیت کے متعلق جو اپنے دور میں مختلف علوم کا بحر بیکراں تھی کوئی ایسی مستند تصنیف شائع نہیں ہوئی جس سے یہ معلوم ہوتا کہ اس عظیم شخصیت نے کیسی کیسی گہر افشانیاں اور صوفشانیاں کیں اور غیر منقسم ہندوستان میں کیا کیا کارہائے نمایاں سرانجام دیئے اور کیسی کیسی علمی اور روحانی شخصیات تیار کیں۔ اس سے قبل صرف ایک مگر نہایت مستند اور جامع مضمون مولانا صلاح الدین شہید سابق ایڈیٹر جسارت و تکبیر کراچی نے ان معلومات کی بنیاد پر شائع کیا تھا جنھیں انہوں نے بڑے تجسس اور کاوش کے بعد سید ابوالاعلیٰ مودودی دہلوی اور سید ابوطاہر صاحب سے جنھیں صوفی عبدالسلام کی خدمت میں تیس سال رہنے کا شرف حاصل تھا، حاصل کی تھیں لیکن اس بات کو بھی زمانہ گزر گیا اور پھر اس

عظیم شخصیت اور اس کا قابلِ تقلید کردار ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔ جو اقوام اپنے اسلاف کو فراموش کر دیتی ہیں وہ ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہوتیں مٹ جاتی ہیں۔ ہمارے خیال میں ہندو پاک میں ابھی کچھ حضرات ایسے ضرور ہوں گے جنہیں مولانا عبدالسلام کی قربت کا شرف حاصل رہا ہوگا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ انہیں تلاش کر کے ایسی عظیم ہستی کے متعلق مزید تحقیق کی جائے اور اس طرح ان کی زندگی کے جو نئے رخ دریافت ہوں ان پر مزید سیر حاصل مضامین تیار کیے جائیں کیونکہ ایسی دیدہ ور ہستیاں صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں ہر روز نہیں تا کہ ہماری نئی نسلیں اپنے اسلاف کے کارناموں سے بہرہ مند اور روشناس ہوسکیں۔

سید ابو طاہر فرماتے ہیں کہ مجھے مولانا موصوف کی خدمت میں ۱۹۲۷ء تا ۱۹۶۳ء یعنی مکمل ۳۶ سال رہنے کا شرف حاصل رہا۔ میری معلومات کے مطابق مولانا عبدالسلام نیازی ۱۸۶۴ء میں سی پی بھارت کے ایک مشہور قصبہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام مولانا عبدالسبحان اور دادا کا نام عبدالوہاب تھا جو سلسلۂ قادریہ کے بہت بڑے بزرگ تھے۔ مولانا ابھی بطن مادری میں تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ اس طرح تقریباً تین سال تک انکی والدہ محترمہ نے انکی پرورش کی اور پھر وہ بھی اپنے خالقِ حقیقی کی طرف مراجعت کر گئیں۔

اس کے بعد مولانا کے دادا نے انکی نگہداشت کی۔ ابھی مولانا کی عمر صرف چھ سال تھی کہ وہ بھی اللہ کو پیارے ہوگئے ابھی کچھ قریبی عزیز بقید حیات تھے لیکن وہ کہاں تھے کچھ معلوم نہ تھا۔ کیونکہ اس زمانے میں یعنی ۱۸۵۷ء میں تحریک آزادی کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس کی ناکامی کے بعد مسلمانانِ ہند پر جو قیامت کبریٰ ٹوٹی اس سے لوگ منتشر ہوگئے۔ اپنے پرائے، دوست احباب جسکو جہاں عافیت ملی چلا گیا۔ بہر حال ایک نیک دل خاتون جنکا تعلق میرٹھ سے تھا اس یتیم بچے کو جسے مستقبل میں علم کا سمندر اور عرب و عجم میں مینارۂ نور بننا تھا اپنے ساتھ میرٹھ لے گئیں اور وہاں مدرسہ خیر المدارس میں داخل کرا دیا۔ آٹھ سال کی عمر میں وہ حافظِ قرآن ہوگئے۔ اور مولانا ہدایت اللہ کا شانی سے جو ایک مشہور عالم تھے بڑی حد تک علم کی پیاس بجھائی مگر علم کی مزید طلب اور وفور شوق نے ایک جگہ ٹکنے نہیں دیا اور رامپور جا کر مولانا عبدالحق رامپوری کی خدمت میں حاضر ہوئے جو مولانا فضل حق خیر آبادی کے شاگرد تھے۔ ان کی خدمت میں چار سال رہ کر دولتِ علم دونوں ہاتھوں سے لوٹی۔ پھر اپنے ماموں یعنی مولانا فضل حق کے صاحبزادے مولانا عبدالحق خیر آبادی سے آٹھ سال تک تحصیل علم کرتے رہے لیکن یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ ان کے اکلوتے بھانجے عبدالسلام عرف جھموں ہیں بہر

حال استاد نے شاگرد میں ذہانت اور علم کا بے پناہ شوق دیکھ کر خصوصی توجہ دی اور علم کا وہ کثیر اور انمول خزانہ جو قدرت نے انہیں عطا فرمایا تھا منتقل کر دیا۔ اس کے بعد مولانا عبدالسلام نیازی ایک جید عالم اور علم کا سمندر بن کر بساط دہر پر ابھرے۔ مولانا کے دل میں طلب علم کا نیا جذبہ بیدار ہوا چنانچہ وہاں سے دہلی واپس آ کر حکیم محمود خان صاحب سے (جو حکیم اجمل خان صاحب) کے والد تھے طب کا علم حاصل کیا۔ اس سے فارغ ہوئے تو نت نئی زبانیں سیکھنے کا سودا سر میں سمایا۔ چنانچہ سر آرنلڈ کو عربی پڑھا کر ان سے انگریزی زبان سیکھی۔ ڈاکٹر ہریچن سے فرانسیسی اور جرمنی زبانیں پڑھیں اور ان کو عربی پڑھا دی۔ پنڈت جگت مہاراج سے سنسکرت سیکھی۔ غرض مولانا بقول ابو طاہر صاحب سریانی، عبرانی، ہکرانی، حمیری، عربی، فارسی، انگریزی، فرانسیسی، جرمنی، لاطینی اور سنسکرت بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ تقریباً بیس سے زیادہ زبانیں مولانا بول اور لکھ پڑھ سکتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ آثار قدیمہ سے برآمد ہونے والے ہزاروں سال پرانے بہت سے نادر و نایاب کتبات جن کے ترجمے کئے گئے وہ سب مولانا موصوف کی زبان دانی کے منہ بولتے ثبوت ہیں۔ اتنی بہت سی زبانیں مولانا نے کہاں سے اور کن حضرات سے سیکھیں کچھ معلوم نہیں۔

سید ابو طاہر نے مولانا عبدالسلام نیازی کی حیات مستعار کا ایک عجیب واقعہ بیان فرمایا ہے جو بقول خود مولانا موصوف کہ میں دہلی میں مدرسۂ امینیہ میں صدر مدرس کی حیثیت سے درس دے رہا تھا کہ اچانک ایک مجذوب آیا اور کہنے لگا۔ او ملا۔ او ملا۔ یہ کیا کام سرانجام دے رہا ہے۔ وہ کیوں نہیں کرتا جس کے لئے تجھے پیدا کیا گیا ہے۔ اس غیر مانوس انداز تخاطب نے میرے تمام وجود کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اب اسکو اس مجذوب کے الفاظ کا سحر کہیے یا میرا نوشتہ تقدیر کہ میں اس مجذوب کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ وہ مجھے ایک جنگل میں لے گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا جس میں دو بوتلیں تھیں۔ اس بزرگ نے اس تھیلے میں سے دونوں بوتلیں نکالیں اور مجھے حکم دیا کہ میں ان کو پی لوں۔ میں نے اسے شراب سمجھ کر پینے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ ان بزرگ نے دونوں بوتلیں کھول کر مجھ پر انڈیل دیں اس مائع میں جو ارغوانی رنگ اور اس قدر خوشبودار تھی کہ ایسی نکہت اور خوشبو میں نے زندگی بھر کسی چیز میں محسوس نہیں کی۔ اس مائع اور خوشبو کا اثر کیا بیان کروں۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ میں ہوش میں ہوتے ہوئے بھی مدہوش تھا اس عجیب و غریب خوشبو سے مجھ پر ایک ایسی انجانی کیفیت طاری ہوئی جسے میں اگر جذب و کیف یا سرمدی اور سرخوشی کا نام دوں تو شاید زیادہ مناسب ہو۔ بہر حال وہ بزرگ تو چلے گئے مگر میں اسی عالم میں تقریباً بارہ سال تک جنگلوں میں مارا مارا پھرتا رہا۔ وہاں جو کچھ میسر آتا

پیٹ کے دوزخ کو بھر لیتا۔ اللہ تعالیٰ نے جنگل میں کیا کیا جڑی بوٹیاں پیدا کی ہیں اور ان میں کیا کیا تاثیر رکھی ہے اس کا اندازہ یا بیان کرنا ممکن نہیں۔ وہ بزرگ جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا ''متوکل شاہ'' اپنے وقت کے مشہور بزرگ تھے۔ ایک روز وہ اسی جنگل میں جہاں میں رہتا تھا تشریف لائے اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے بریلی لے گئے اور شاہ نظام حسنؒ کی خدمت پیش فرما دیا اور کہا ''برتن مانجھ کر لایا ہوں اس میں قلعی فرما دیجئے۔

سائیں کی آمد پر شاہ نظام حسن کھڑے ہو گئے اور بڑے تپاک سے انہیں اپنے پاس بٹھایا۔ پھر شاہ متوکل صاحب کی موجودگی میں میں نے قبلہ ''شاہ نظام حسن'' صاحب کے دستِ حق پرست بیعت کی اور اس کے بعد انہوں نے مجھے اپنی خدمت میں رہنے کی اجازت مرحمت فرمادی۔ یہ بزرگ مجھے اپنے ساتھ ہی کھانا کھلاتے۔ نیازی صاحب فرماتے تھے کہ میں سات سال اپنے شیخ کامل کی خدمت میں حاضر رہا۔ بقول جناب سید ابو طاہر کہ اس طویل عرصہ میں مولانا عبدالسلام نیازی صاحب نے روحانیات و عرفانیات کے وہ اعلیٰ مراحل طے کئے جہاں حجابات کے پردے اٹھ جاتے ہیں اور چیزیں آئینے کی طرح صاف نظر آنے لگتی ہیں مگر زبان پر تالے پڑ جاتے ہیں ہونٹ سل جاتے ہیں۔

دہلی میں ایک معروف پنڈت شنکر داس کو جنہیں سنسکرت اور گیتا پر عبور حاصل تھا۔ ہندو قوم میں بڑی قدر و منزلت حاصل تھی۔ مولانا کو خود بھی گیتا پر عبور حاصل تھا ہندو قوم میں بڑی قدر و منزلت حاصل تھی۔ مولانا گیتا اور سنسکرت کے عالم تھے اور گیتا سے اس طرح حوالے دیتے تھے جیسے وہ اس کے حافظ ہیں یہی وجہ تھی کہ پنڈت جی اپنے چیلوں کے ہمراہ مولانا کے پاس آتے تھے اور خرقِ عادت کے عجیب و غریب مظاہرے کرتے تھے ایک دن مولانا نے دریافت کیا کہ یہ کمال آپ کو کیسے حاصل ہوا۔ پنڈت جی نے کہا کہ میں نے زندگی بھر اپنے نفس پر قابو پانے کی کوشش کی اور ہر کام اپنے نفس کے خلاف انجام دیا۔ اس عمل نے مجھے اس مقام پر پہنچا دیا۔ مولانا نے فرمایا ''اچھا یہ بتایئے کہ اسلام کے متعلق آپکا نفس کیا کہتا ہے۔ اس پر پنڈت جی نے کہا دیکھئے مولانا۔ یہ بات نہ کیجئے۔

مولانا نے فرمایا کہ مجھ کو دھوکہ دیتا ہے مجھے نفس پر قابو ہے اور میں اس کے خلاف کام کرتا ہوں۔ اب جب معاملہ کی بات آئی تو جواب دینے سے گریز پا ہے۔ ''یہ فریب اور یہ چالاکی''۔۔۔غور سے سن کہ مسلمان نہ کسی کو دھوکہ دیتا ہے اور نہ کسی سے دھوکہ کھاتا ہے۔ یہ بات مولانا نے کچھ ایسے جذب کے عالم میں فرمائی کہ پنڈت کے ہوش اڑ گئے اس کے دل پر ایک بجلی سی گری اور اس نے مع اپنے چیلوں کے اسلام قبول

کرلیا۔ یہ بات شہر میں آگ کی طرح پھیل گئی اور ہندو قوم میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ دہلی میں ایک کہرام مچ گیا۔ کہا جاتا ہے کہ مولانا کے ہاتھ پر مختلف اوقات میں ۳۶ ہزار افراد نے اسلام قبول کیا جن میں ہندو، سکھ عیسائی اور قادیانی شامل تھے۔

مولانا عبدالسلام نیازیؒ کے دینی ادراک اور علمی فضیلت کا ایک اور واقعہ حضرت سید ابو طاہرؔ نے نقل فرمایا کہ ایک صاحب جو مدینہ منورہ کے ایک معروف عالم دین تھے مولانا نیازی مرحوم کے پاس تشریف لائے۔ وہ اندر آئے تو مولانا نے دریافت کیا کون صاحب ہیں۔ جواب ملا۔ عبدالرحمٰن بن الحسن مدنی، فرمایا تشریف لایئے۔ وہ اندر آئے تو مولانا بڑی عزت واحترام سے پیش آئے اور پوچھا کیسے آنا ہوا۔ جواب دیا اکیس علمی اعتراضات ہیں ان کے جواب کیلئے آیا ہوں۔ مولانا نے دریافت کیا مفتی کفایت اللہ صاحب کے پاس گئے تھے۔ جواب ملا وہ طفلِ مکتب ہیں۔ پوچھا مولانا حسین احمد مدنی کے پاس گئے تھے۔ جواب دیا وہ تاریخ اور جغرافیہ اچھا جانتے ہیں۔ پھر سوال کیا مولانا ابوالکلام آزاد کے پاس بھی گئے تھے۔ جواب ملا کہ علم تھا مگر مغلوب ہو چکا ہے۔ اس دوران دہلی کے علماء کرام کو معلوم ہو چکا تھا کہ عبدالرحمٰن بن الحسن مدنی مولانا عبدالسلام نیازیؒ کے پاس گئے ہیں چنانچہ علماء آنا شروع ہوئے جو آتا اپنا رومال بچھا کر بیٹھ جاتا۔ مولانا کا کمرہ اور باہر کا حصہ پُر ہو گیا۔ مولانا عاشق میاں اور سید ابو طاہر جنہیں مولانا کی خدمت میں طویل عرصہ رہنے کا شرف حاصل تھا دونوں ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ چنانچہ انکی موجودگی میں عبدالرحمٰن بن الحسن مدنی نے اعتراضات بیان کرنا شروع کیے۔ مولانا جونہایت انہماک اور توجہ سے اعتراضات سن رہے تھے کبھی کبھی ان کے چہرے سے کرب اور تکلیف کے آثار نمایاں ہوتے لیکن وہ سب کچھ برداشت کرتے رہے اور جب اعتراضات ختم ہو گئے تو مولانا نے فرمایا۔ صاحبزادے مدینہ منورہ سے آئے ہو اس لئے لحاظ کر رہا ہوں۔ پھر فرمایا بیوقوف انسان۔ اس طرح کے دو سو مزید اعتراضات ہو سکتے ہیں اور پھر وہ اعتراضات لکھوانے شروع کئے۔ سات دن تک لکھواتے رہے۔ جب وہ مکمل ہو گئے تو فرمایا جوابات انشاءاللہ تعالیٰ کل سے شروع کروں گا۔ دوسرے دن سے جوابات لکھوانا شروع کئے اور گیارہ دن میں مکمل کیے۔ جوابات لکھوانے کا سلسلہ فجر کی نماز کے بعد شروع ہوتا اور رات دس بجے تک جاری رہتا۔ نمازوں کیلئے وقفہ دیدیا جاتا۔ جوابات کے دوران دیکھا گیا کہ عبدالرحمن بن الحسن مدنی اپنی جگہ سے اٹھتے۔ فرطِ مسرت اور وفورِ عقیدت میں مولانا کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے۔

جوابات ختم ہونے کے بعد عبدالرحمٰن صاحب نے عرض کیا کہ بندہ مولانا کی خدمت میں تحصیل علم کے لئے رہنا چاہتا ہے۔ مولانا نے جواب دیا کہ میں کرائے کے ایک کمرہ میں رہتا ہوں۔ میرے پاس آپکو ٹھہرانے کی جگہ نہیں ہے اور نہ ہی اس بات کا اہتمام ہے کہ کھانے پینے کا بندوبست کیا جائے۔ پھر شرط یہ ہے کہ

فجر کی نماز کے بعد پڑھاؤں گا۔ اگر وقت پر نہ آئے تو بھگادوں گا۔ انہوں نے تینوں شرطیں منظور کر لیں۔ اور تین سال علم حاصل کیا۔ اکثر فرماتے کہ ہندوستان کے لوگ بڑے خوش نصیب ہیں کہ مولانا عبدالسلام جیسا علم کا سمندر ان کے درمیان موجود ہے۔ جن لوگوں کو مولانا کا قرب حاصل تھا ان سے کہتے کہ آپ لوگوں پر رشک آتا ہے کہ آپ کو مولانا کی قربت نصیب ہے پھر فرماتے کہ میں عرب و عجم میں گھومتا ہوا آیا ہوں مجھے ایسا علم کا بحر بیکراں کہیں نہیں ملا۔ علم ظاہری کے علاوہ علم باطنی یعنی روحانیات میں بھی مولانا بہت بلند مرتبہ پر فائز ہیں۔

مولانا عبدالسلام نیازیؒ کا موضوع خاص حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان محبوبیت تھا جب مولانا بیان فرماتے تو انداز ایسا ذہن گیر اور پُر تاثیر ہوتا کہ لوگوں پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ خود مولانا پر ایسا عالم اور کیف طاری ہوتا کہ ہوش میں ہوتے ہوئے بھی مدہوش ہو جاتے اور آنکھوں سے جھڑی لگ جاتی اور لوگ پہروں اس روحانی کیف و سرور سے سرشار رہتے۔

مولانا بڑے درویش صفت انسان تھے "خدا خوش رکھے" انکا تکیہ کلام تھا۔ تمام زندگی نہایت سادگی اور بے نیازی کے عالم میں گزار دی۔ علم کی دولت اور کردار کی عظمت نے دنیاوی غرض و طمع سے بے نیاز کر دیا تھا جب حجابات کے پردے نگاہوں سے اٹھے تو دنیا کی رنگینیاں معدوم ہو گئیں۔ شادی بیاہ کچھ نہیں کیا۔ روحانیات کی نیرنگیوں نے ایسا مدہوش و سرشار کیا کہ دنیا اور اس کی کشش بے معنی ہو کر رہ گئیں۔ مگر مزاج بلا کا جلالی ہو گیا۔

کچھ ارباب اقتدار کو مولانا کے متعلق یہ شکایت تھی کہ بعض اوقات ان کا لب و لہجہ نہایت درشت اور ترش ہو جاتا تھا جب جناب طاہر میاں سے اس کی وجہ دریافت کی گئی تو انہوں نے فرمایا کہ مولانا کیلئے انتہائی ناپسندیدہ بلکہ ناقابل برداشت چیز "منافقت" تھی۔ جب ان کا ادراک اور روحانیت حاضر ہونے والے شخص کی منافقت کی تصدیق کر دیتی تو انکا جلال سوا تر اور رویہ زیادہ سخت ہو جاتا اور وہ اس کو بھگا دیتے تھے۔

ایک مرتبہ حیدر آباد دکن کے وزیر اعلیٰ سر اکبر حیدری والی دکن میر عثمان علی خاں کا بلاوا لیکر مولانا عبدالسلام نیازی کے پاس جا رہے تھے۔ گلی سے ہٹو بچو۔ کی صدائیں آرہی تھیں۔ پھر زینے پر کسی کے چڑھنے کی آہٹ ہوئی۔ صوفی صاحب نے اپنی پاٹ دار آواز میں دریافت کیا کون؟ جواب میں سر اکبر حیدری نے سیڑھیوں سے ہی اپنا نام اور آنے کا مقصد بیان کیا۔۔۔ مولانا نے گرج کر کہا۔۔۔ آپ کی قسمت میں جتنی سیڑھیاں لکھی تھیں وہ آپ چڑھ چکے۔۔۔ اب اور آگے بڑھنے کی کوشش نہ فرمائیں۔ اور خدا خوش رکھے آپ اپنے رئیس سے ہماری طرف سے کہہ دیں کہ اس فقیر کے قدموں کی خاک کا ذرہ بھی اگر ترازو کے ایک پلڑے

میں ہو۔ اور دوسرے میں وہ خود اپنی دولت سمیت کر بیٹھ جائیں تو اس فقیر کا پلڑا زمین پر ہی رہیگا۔ اور جس پلڑے میں آپ کے رئیس اعظم اپنی پوری ریاست کے وزن کیساتھ بیٹھے ہوں گے وہ زمین اور آسمان کے درمیان معلق رہیگا۔ کیا سمجھے۔۔۔ جائیے خدا خوش رکھے۔

تقسیم ہند کے بعد ہندوستان کے صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد۔ اور وزیر اعظم پنڈت جواہرلال نہرو ایک بار صدر اور وزیر اعظم کی حیثیت سے مولانا موصوف کی ملاقات کیلئے گئے۔ مولانا کی زندگی کا یہ وہ حصہ تھا جب آپ بینائی سے محروم ہو چکے تھے مگر ان کے جلال اور مزاج کی اکڑ میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد نے مولانا سے کہا حضرت آپ آنکھیں بنوالیں۔ مولانا نے فرمایا خدا خوش رکھے ان آنکھوں سے جو صورتیں دیکھتا تھا۔ جب وہ اوجھل ہو گئیں تو اب آنکھیں بنوا کر کسے دیکھونگا۔۔۔ آپ کو؟ ڈاکٹر صاحب کے بیان اور درخواست پر زور دیتے ہوئے پنڈت جی نے بھی عرض کیا مولانا ڈاکٹر صاحب نے صحیح عرض کیا ہے آپ آنکھیں بنوا ہی لیجئے۔ مولانا نے جواب دیا خدا خوش رکھے۔ اگر میری بصارت بحال ہو بھی جائے تو آپ مجھے اپنی صورت نہ دکھایئے گا۔

مولانا کی علمی عظمت اور روحانی قوت کے آگے ہندوستان کی طاقت کے یہ دونوں ناخدا ڈاکٹر راجندر پرشاد اور پنڈت جواہرلال نہرو بے بس ہو کر خاموشی کیساتھ واپس چلے آئے اور زبان سے کچھ بھی نہ کہہ سکے۔ مگر مولانا کے ایک نہایت درشت فقرے نے وہ تمام روح فرسا اور دل خراش داستان بیان کر دی جو مسلمانان ہند کے ساتھ تقسیم ہند کے وقت روا رکھی گئی تھی۔ اور جس کی تمام تر ذمہ داری پنڈت جواہرلال نہرو پر بحیثیت وزیر اعظم ہندوستان عائد ہوتی تھی۔

تو یہ تھے مولانا صوفی عبدالسلام نیازیؒ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے استاد مکرم جنکا انتقال سو سال سے زیادہ عمر میں ۱۹۶۶ء میں دہلی میں ہوا اور آل انڈیا ریڈیو کے اعلان کے مطابق تقریباً ۱۳ لاکھ افراد نے ان کے جنازے میں شرکت کی جس میں اکابرین سلطنت، جید علمائے کرام مشاہیر اور مختلف طبقہ ہائے فکر کے ارباب شامل تھے۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را۔

نوید ظفر

صوبہ سرحد کے قبائلی علاقے

پشاور صدیوں سے وسطی ایشیا کا اہم تجارتی مرکز رہا ہے۔ سمرقند' بخارا' تاشقند' کابل' ھرات' قندھار' بلکہ بغداد اور دمشق سے قافلے ہندوستان جانے کے لئے پہلا پڑاؤ پشاور میں ڈالتے۔ قصہ خوانی بازار کی سرائے میں قیام کرتے' قصہ کہانیوں سے لطف اندوز ہوتے اور پھر دلی کے راستے پر گامزن ہو جاتے۔ پشاور اور وسطی ایشیا کے درمیان ان کی گذرگاہ کوہ ہندوکش کے درمیان اہم تاریخی درہ خیبر ہوتا۔ اس درہ کے بارے میں مختلف مورخین اور حکمرانوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ سکندر اعظم کے عہد سے یہ مختلف حملہ آوروں کی گزرگاہ رہا ہے۔

وسطی ایشیاء سے مختلف مسلمان فاتحین بابر' امیر تیمور' محمود غزنوی' ہندوستان میں داخل ہوئے اور دلی کے دعویدار بنے۔ اسی درہ کو نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی' الغرض کئی مسلمان تاجداروں نے استعمال کیا۔ حفیظ جالندھری نے درہ خیبر پر ایک طویل نظم تحریر کی' جس کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

نہ اس میں گھاس اگتی ہے' نہ اس میں پھول کھلتے ہیں ---- مگر اس سرزمین سے آسماں بھی جھک کے ملتے ہیں

یہاں سے بارہا گزرے اتالے بارگاہوں کے ---- قدم چومے ہیں اس مٹی نے اکثر بادشاہوں کے

کہاں اب وہ شکوہ نادری' اقبال ابدالی ---- لیا کرتے تھے جن سے سخت پتھر درس پامالی

یہ ہے وہ خارزار اس میں ہزاروں آبلے پھوٹے ---- نہیں ٹوٹے مگر یہ سنگ دل کانٹے نہیں ٹوٹے

درہ خیبر پشاور سے ۱۷ کلومیٹر کے فاصلے پر جمرود میں واقع ہے۔ اس مقام کا نام ایرانی بادشاہ جمشید کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہاں پر ایک قدیم تالاب کے آثار بھی ملتے ہیں جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے جمشید بادشاہ نے بنایا تھا۔ درہ خیبر سطح زمین سے ۱۵۱۲ فٹ بلند ہے' درہ خیبر سے کوہ ہندوکش کا سلسلہ ایک وادی کی شکل اختیار کرتا ہے' پشاور شہر اس وادی میں آباد ہے۔

جمرود میں ایک قلعہ بھی موجود ہے جس کی شکل ایک جنگی جہاز جیسی ہے' سکھ جرنیل ہری سنگھ نلوہ

افغانوں سے ایک جنگ میں یہاں قتل ہوا تھا اور اسی کی سمادھی یہاں بنائی گئی تھی۔

جمرود سے دس کلومیٹر کے فاصلے پر ایک قلعہ شگائی کے مقام پر انگریزوں نے ۱۹۲۰ء میں تعمیر کروایا تھا۔
انگریزوں اور افغان لڑائیوں میں ہلاک ہونے والے برطانوی فوجیوں کا ایک قبرستان بھی یہاں واقع ہے۔

درۂ خیبر میں سطح سمندر سے ۳۱۲۷ فٹ کی بلندی پر ایک تاریخی مسجد' علی مسجد کے نام سے مشہور ہے اس کے بارے میں مختلف روایات ہیں' یہاں درۂ خیبر تنگ ہو کر صرف ۱۵ فٹ رہ جاتا ہے۔ بعض مقامی روایات کے مطابق حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ نے یہاں قیام فرمایا تھا اور عبادت کی تھی۔ بعض دیگر روایات کے مطابق یہاں کے ابتدائی شہری مدینہ کے شکست خوردہ یہودی تھے جو خیبر کی جنگ میں شکست کھا کر یہاں آباد ہوئے تھے' اور انہوں نے اس مقام کو خیبر کا نام دیا۔ اسی نسبت سے درۂ خیبر کی سرحد پر افغانستان اور پاکستان کے درمیان آخری چیک پوسٹ کا نام طورخم ہے۔ جو یہودیوں اور مسلمانوں دونوں کے لئے کوہ طور کے حوالے سے ایک نسبت رکھتا ہے۔ کوہ طور سینائی کے صحرا میں وہ اہم پہاڑ ہے' جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہوئے تھے۔

درۂ خیبر میں لنڈی کوتل کی اہم تجارتی منڈی واقع ہے' جہاں سیاح خریداری میں مصروف نظر آتے ہیں ایسی ہی ایک تجارتی منڈی باڑہ میں واقع ہے۔

درہ خیبر کے علاوہ پشاور کے نزدیک درہ آدم خیل واقع ہے۔ جو پشاور اور کوہاٹ کو منسلک کرتا ہے' یہاں پر مقامی لوگ ہتھیار بنانے کا کام صدیوں سے کر رہے ہیں۔ درہ آدم خیل' آدم خیل آفریدیوں کا گڑھ سمجھا جاتا ہے۔ لنڈی کوتل' درہ آدم خیل اور کوہاٹ میں بہت سے تعلیمی مراکز' سکول اور کالج طلباء کی تعلیم کا مرکز بن چکے ہیں۔

خیبر کے آفریدیوں کے ساتھ ساتھ کرم ایجنسی کا صدر مقام پاراچنار' ایک صحت افزاء' تاریخی وادی ہے' ۵۷۳۳ فٹ کی بلندی پر پارہ چنار کوہ سفید کے دامن میں واقع ہے' اس شہر کی روایات بہت مشہور ہیں' ایک روایت کے مطابق یہاں ایک قدیم چنار کا درخت تھا' جس کے سائے میں پارا قبیلے کے افراد اکٹھے ہوتے تھے۔

۱۹۳۰ء میں افغانستان میں ایک حکمران بچہ سقہ کے نام سے گزرا ہے' ایک روایت کے مطابق بچہ سقہ اپنے ابتدائی دور میں پاراچنار میں مقیم تھا۔ لوگوں کے گھروں میں پانی پہنچانے کی ملازمت کرتا تھا۔

پاراچنار میں بہت سے تعلیمی ادارے' بنک اور ہسپتال قائم ہو چکے ہیں' پاراچنار تھل سے ۹۰ کلومیٹر

اور افغانستان کی سرحد سے ۲۰ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے' سڑک بہت پختہ ہے اور سفر کے دوران یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ ۲۰۰۰ فٹ کی بلندی تک پہنچ چکے ہیں' پاراچنار سے ۵۶ کلومیٹر کے فاصلے پر علیزئی تاریخی مقام ہے' جہاں یونانی عہد کے آثار پائے جاتے ہیں علیزئی سے دس کلومیٹر کے فاصلے پر آراوالی واقع ہے' جس کی اہمیت سردیوں میں برف باری کے حوالے سے ہے' برف آراوالی سے آگے اور نیچے آبادی تک نہیں پہنچتی۔ گویا سردیوں کی برف باری کے لئے آراوالی پاراچنار کی آخری سرحد ہے۔

پاراچنار کے شمال مشرق میں ۸ کلومیٹر کے فاصلے پر کرمان کا خوبصورت باغ واقع ہے' جو اپنے سنہری سیبوں کے لئے بہت مشہور ہے۔

پاراچنار کے شمال مشرق میں امام باغ' زیران اور شعلہ زن بھی اپنی خوبصورتی کے لئے مشہور ہیں' شعلہ زن کی وجہ شہرت جیسا اس کے نام سے ظاہر ہے مقامی عورتوں کی خوبصورتی ہے' افغانستان اور دہلی کے مغل حکمرانوں میں بعض بادشاہوں کی ملکائیں اس قصبہ سے تعلق رکھتی تھیں' افغانستان کے حکمران امیر عبدالرحمٰن کی وادی کا تعلق بھی اسی علاقے سے تھا' ایک قدیم روایت کے مطابق کرم ایجنسی میں خوبصورت پتھر ملانا میں' چاول کرمان میں' لکڑی پیواری اور لڑکی شعلہ زن کی۔

شعلہ زن اپنے سبز باغات اور سنہری سیبوں کے لئے بھی مشہور ہے۔ پہاڑوں کے دامن میں پارا چنار کے نزدیک کمرلاچی' احمد زئی اور پیوار کوتل بھی خوبصورت چشموں اور سرسبز وادی کے حوالے سے اہم قصبات ہیں' سفید کوہ کے دامن میں یہ مقامات خوبصورتی میں بے مثل ہیں' قدرتی آبشاریں' علاقے کی خوبصورتی میں مزید اضافہ کرتی ہیں' کلاچی میں لالہ گل کا مقبرہ بھی زائرین کی توجہ کا مرکز رہتا ہے۔

شمالی وزیرستان کا صدر مقام میران شاہ ہے جو بنوں سے ۶۰ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ میران شاہ کی وجہ شہرت ٹوچی سکاؤٹ اور ایک قدیم قلعہ ہے' ایک سٹیڈیم بھی یہاں تعمیر کیا گیا ہے۔ دیگر آبادیوں میں سپن وام' میر علی' جویا اور درپسل ہیں' کرم ایجنسی کا سب سے اہم شہر ازبک ہے' جو پختہ سڑک کے ذریعہ بنوں سے ۹۰ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے' ازبک ۶۵۰۰ فٹ کی بلندی پر ایک صحت افزاء مقام ہے' انگریزی عہد میں اسے افغانستان سرحد پر ایک اہم چھاؤنی کا درجہ حاصل تھا اور یہاں تین میل کے علاقے پر فوجی بیرکس رہائش گاہیں' اسکواش کورٹ' کھیلوں کے میدان اور تھیٹر قائم تھے۔ ۲۰۰۰۰ سے زیادہ فوجی یہاں تعینات تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد اس جگہ کی فوجی اہمیت ختم ہو جانے سے ازبک کی رونق بھی جاتی رہی۔

شمالی وزیرستان کی طرح جنوبی وزیرستان بھی قبائلی علاقوں میں خصوصی اہمیت رکھتا ہے' ٹانک سے ۱۴۰ کلومیٹر دور وانا جنوبی وزیرستان کا صدر مقام ہے۔ مقامی آبادی میں احمد زئی وزیری اور برکی مشہور ہیں۔ پاکستان کے ایک سابق جرنیل اور وزیر جنرل واجد علی برکی اور مشہور کرکٹ کھلاڑی ماجد خان' جاوید برکی اور ڈاکٹر جہانگیر خان کا تعلق بھی جنوبی وزیرستان کی اڈمر شاخ سے ہے' جن کا علاقہ کانی گرم کہلاتا ہے۔ جنوبی وزیرستانی سکاؤٹوں کا مرکز سروکائی ہے۔ گجوری کچ کے مقام پر گول دریا پر بند باندھ کر ایک ڈیم تعمیر کیا گیا ہے جس سے علاقہ میں پانی اور بجلی مہیا ہوتی ہے۔

انگریزی عہد میں جنوبی وزیرستان کے قبائلی افراد نے انگریزوں کے خلاف سخت مدافعت کی اور انگریزی فوج کا جانی اور مالی نقصان جس قدر جنوبی وزیرستان میں ہوا' اتنا اور کہیں نہیں ہوا۔ اس حوالے سے محسود قبیلہ کے ملا پونڈا اور مرزا علی خان جنہیں فقیر ایپی کا نام دیا گیا' خصوصی شہرت رکھتے ہیں۔

وزیرستان کے قبائلی عوام کی انگریزوں سے جنگ کی بڑی وجہ ڈیورنڈ لائن کی سرحد تھی' جو ۱۸۹۳ء میں افغانستان کے حکمران امیر عبدالرحمٰن برطانوی جرنیل ڈیورنڈ کے درمیان ایک معاہدے کے بعد عمل میں آئی۔ معاہدے کے فوراً بعد جب دونوں مملکتوں کا نقشہ جاری کیا گیا تو امیر عبدالرحمٰن اور وزیرستانی قبائل نے برطانیہ پر دھوکا دہی کے الزامات لگائے اور بغاوت کر دی ایسے ہی الزامات سلطنت برطانیہ پر ۱۹۴۷ء میں لگائے گئے جب مسلمان اکثریت کے علاقے فیروز پور' پٹھان کوٹ اور گورداسپور ۱۴ اگست کے بعد ہندوستان کے حوالے کیے گئے۔

ستمبر ۱۸۹۷ء میں ملا سید اکبر کی زیر کمان ۱۵۰۰۰ آفریدی اور اورکزئی ہنگو کی ۷۰۰۰ انگریزی فوج پر حملہ آور ہوئے۔ انگریز جنرل لوک ہارٹ LOCKHART نے مقامی آبادی کے تمام گاؤں اور جنگلات نذر آتش کر دیے۔ چنانچہ وہ علاقہ جہاں بابر نے سولہویں صدی میں گینڈے کا شکار کھیلا' آج وہاں گھاس کی ایک پتی بڑی مشکل سے نظر آتی ہے۔

اس تمام کارروائی کے باوجود انگریزی فوج نے علاقہ پر ہوائی جہازوں سے بمباری کی پالیسی اپنائی اور زمینی فوج کی کارروائی سے ہاتھ اٹھا لیا۔

۱۳ نومبر ۱۹۳۶ء کو لندن کی Royal Society of Central Asia سے خطاب کرتے ہوئے برطانوی چیف آف آرمی سٹاف جنرل Sir Kenneth Vigram نے کہا کہ وزیرستان میں ہماری پالیسی

Burn and Scuttle کی تھی یعنی آگ لگاؤ اور بھاگو۔

وزیرستان کے بعد ہم مہمند ایجنسی کے صدر مقام ایکا گنڈ پہنچتے ہیں' یہاں اب سکول کالج اور ہسپتال قائم ہو چکے ہیں' پشاور سے تقریباً ۵۰ کلومیٹر دور وارسک ڈیم جو ۱۱۲۰۰۰ ایکڑ زمین کو سیراب کرتا ہے اور ملک کو ۲۴۰۰۰۰ کلوواٹ بجلی مہیا کرتا ہے' اسی ایجنسی میں واقع ہے۔

وارسک کی طرح صوبہ سرحد میں ایک اور اہم بجلی مہیا کرنے کا مرکز درگئی میں ہے۔ جو درہ ملاکنڈ میں نوشہرہ سے ۶۰ کلومیٹر دور واقع ہے' سطح سمندر سے ملاکنڈ ۲۷۰۵ فٹ بلند ہے اور آب و ہوا کے اعتبار سے بڑا خوشگوار علاقہ ہے' یہاں پر ایک فوجی چوکی میں برطانیہ کے سابق وزیر اعظم ونسٹن چرچل نے فوجی خدمات سرانجام دی ہیں۔ ملاکنڈ کا سب سے اہم شہر شاہ کوٹ ہے' جہاں زرعی اور صنعتی اجناس کے حوالے سے فیکٹریوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے' ملاکنڈ بھی انگریزی لشکر کشی کو روکنے میں اہم تاریخی مرکز رہا ہے اور ۱۸۹۵ء میں یہاں خونریز جنگیں لڑی گئیں۔ درگئی سے چند میل کے فاصلے پر جبن کے مقام پر دریائے سوات دو میل تک ایک سرنگ سے گذرتا ہے' سرنگ سے نکلنے کے بعد دریا کے آبشار سے بجلی پیدا کی جاتی ہے۔ نزدیک ہی بٹ خیلہ' امان درہ اور تھانہ کی خوبصورت مقامی بستیاں ہیں۔

ملاکنڈ ڈویژن میں دیر ڈسٹرکٹ بھی واقع ہے' جہاں اہم تاریخی کھنڈر ہیں' دیر سے تقریباً سو کلومیٹر کے فاصلے پر چکدرہ کا خوبصورت تاریخی شہر دریائے سوات کے کنارے واقع ہے' ایک روایت کے مطابق دور اکبر کا مزاح گو جرنیل بیربل سوات فتح کرنے کی مہم میں یہاں ۱۵۸۶ میں قتل ہوا تھا۔ چنانچہ اگلے برس مغل جرنیل زین خان نے علاقہ فتح کر کے یہاں ایک قلعہ تعمیر کیا' جو آج بھی موجود ہے۔

چکدرہ سے ۴۰ کلومیٹر کے فاصلے پر تحصیل ہیڈ کوارٹر تیمر گرہ واقع ہے' شہر کا نام امیر تیمور کی نسبت سے رکھا گیا' دریائے پنج کوڑہ کا پل اور بلم بٹ کا قلعہ سیاحوں کی دلچسپی کے خصوصی مراکز ہیں۔

نزدیک ہی رباط اور ہمل کے باغات ہیں' جو مالٹوں اور کینوؤں کے لئے مشہور ہیں' دیر ڈسٹرکٹ میں ورائی' حیاسری' لال قلعہ' منڈا' بروا' اچ' زیارت اور قلعہ شاہی اپنی قدرتی خوبصورتی کے لئے مشہور ہیں' زیارت' بابا جلال بخاریؒ کی زیارت اور قدیم بدھ کھنڈروں کے سبب مشہور ہے' قلعہ شاہی افغانستان کی سرحد سے صرف ایک میل کے فاصلے پر ہے' یہاں ایک چیک پوسٹ بھی ہے تو یہ تھی افغانستان کی سرحد کے ساتھ ساتھ ہمارے صوبہ سرحد کے قبائلی علاقوں کی کہانی۔

طنز و مزاح　　　　پروفیسر ڈاکٹر عاصی کرنالی

کان پر رکھ کر قلم نکلے

غالب صبح ہوتے ہی کان پر قلم رکھ کر نکلتے تھے کہ کوئی "اُن" کو ان سے خط لکھوائے تو یا اپنے بھی دو حرف لکھ دیں یا محبوب انداز خط سے پہچان لے کہ کالے خاں کریانہ فروش یا اللہ بخش زرگر کا یہ خط کس قلم سے ہے۔ ہماری مشکل غالب سے کچھ زیادہ ہے۔ ہم جو کہ ادیب ہیں اور ہمارے خمیر میں مروّت کی مٹی کچھ زیادہ ہی شامل ہو گئی ہے اہل حاجت خود ہمیں ڈھونڈ لیتے ہیں اور کہتے ہیں "لکھو ہمارے لئے ایک عدد تقریر" یہ فرمائش اس انداز میں ہوتی ہے جیسے قرض خواہ مقروض کو حکم دیتا ہے "ابھی ادا کرو ہمارا قرض ورنہ۔۔۔"

میں بھی ایک بے چارہ مروت کا مارا ہر کارہ ادیب ہوں اور مجھے بھی اپنی خواہش کے خلاف اپنی تخلیقی امنگ کے برعکس ایسی تقریریں لکھنی پڑتی ہیں اور میں انکار نہیں کر سکتا۔ میرے لیے کوئی راہ فرار نہیں ہے کیونکہ مروت کی مٹی نے مجھے مٹی میں ملا دیا ہے۔

جلسے اور تقریبیں ہوتی رہتی ہیں ان کا کوئی شمار قطار نہیں، علم سے لے کر قلم تک، ادب سے لے کر شور و شغب تک، سالگرہ سے لے کر تقریب ختنہ تک جلسوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ اُن میں صدارت کرنے والے اہل کمال، خطابت کے پھول برسانے والے مقررین، سٹیج کنڈکٹ کرنے والے سکرٹری صاحبان سب کے لئے تقریریں لکھنی پڑتی ہیں کیونکہ یہ خود دو لفظ لکھ نہیں سکتے، دو جملے بول نہیں سکتے لوگ انہیں کرسی صدارت پیش کرتے ہیں۔ مہمانان خصوصی بناتے ہیں اس لئے کہ دولت یا عہدے یا حیثیت کی بناء پر بڑے آدمی ہیں اور صدارت ان کا، انہی کا حق بنتا ہے۔ رہی تقریر سو میں اور مجھ جیسے ادیب موجود ہیں جو مروت میں ۔۔۔۔۔ (اس ادھورے فقرے کو قارئین خود مکمل کر لیں)

فرمائشی تقریریں لکھنا میرے لئے کمائی کا ذریعہ نہیں۔ آپ یقین کیجئے میں نے سینکڑوں ہی تقریریں لکھ ڈالیں اور میں نے ایک پیسہ بھی نہیں کمایا۔ کوئی دیتا ہی نہیں، میں مانگتا نہیں مانگ ہی نہیں سکتا کیونکہ ایسے لوگ یا تو نام نہاد دوستی کے زمرے میں آتے ہیں یا دوستوں کی معرفت کام نکلواتے ہیں یا ایسے عہدے پر فائز ہوتے ہیں کہ انکار کی صورت میں نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ بلکہ ایک دو بار نقصان اٹھایا بھی

ہے (خوف فسادِ خلق یا نقصان جان ومال وآبرو کے اندیشے سے مثال نہیں دی جاسکتی) الغرض ان ضرورت مند نالائقوں کی سینکڑوں اقسام ہیں کسی نہ کسی صورت میں ان کا پریشر ایسا ہوتا ہے کہ "تقریر پھڑکتی ہوئی ہو شاندار، بے مثال لوگ فقرے فقرے پر جھوم اٹھیں اور دوسرے مقررین کے درمیان بس میری ہی تقریر نمبر ون رہے، بلکہ اے ون، مناسب ہو تو جگہ جگہ اشعار بھی ہوں اور ایسے ہوں جیسے انگوٹھی میں نگینہ، بس پھڑکتے اور پھڑکاتے ہوئے۔" میں یہ سب کچھ سن کر عرض کرتا ہوں۔ "تقریر کا ایک صفحہ کافی ہوگا"۔ وہ حیرت سے فرماتے ہیں" سات آٹھ صفحے تو ہوں بڑے سائز کے، صفحے ڈیڑھ صفحے میں تو مقرر گرم ہوتا ہے اور میں تو صدر ہوں مجھے تو زیادہ بولنا چاہئے"۔ اب میں وقت نکال کر دو تین گھنٹے سر کھپا کر ایک لمبی چوڑی مرصع مسجع آراستہ پیراستہ رنگین اور جذبات انگیز فقروں سے پُر شعروں سے لبریز تقریر لکھتا ہوں۔ انہیں سناتا ہوں، کئی بار ریہرسل کراتا ہوں لیکن ان کا غلط تلفظ اور شعروں کو غلط سلط اور بے وزن پڑھنے کا عمل مجھے ہلاک کر ڈالتا ہے۔ میں کہتا ہوں علم وہ فرماتے ہیں۔ علم شعر کا رٹا ہزار بار لگواؤں گا لیکن سر جلسہ وہی غلط پڑھ کر رہیں گے۔ مثلاً ایک صاحب نے حریفانہ تقریر لکھوائی۔ یہ شعر تقریر میں تھا۔

خون کے رنگ کو تم رنگ حنا کہتے ہو یہ جو دامن پہ ہیں دھبے انہیں کیا کہتے ہو

کوئی پچاس دفعہ اُن صاحب کو یہ شعر رٹوایا گیا اور آخر میں کچھ ٹھیک پڑھنے لگے لیکن جلسے میں (جہاں بدقسمتی سے میں بھی شامل تھا) موصوف نے یہ شعر یوں ارشاد فرمایا

"لہو کے رنگ کو آپ حنا کا رنگ کہتے ہو

اور بے شرمو یہ جو تمہارے دامن پر جگہ جگہ دھبے ہیں انہیں کیا کہتے ہو کیا بکتے ہو"

اب چند واقعاتی مثالوں سے اُس آتش دوزخ کی تپش کا کچھ اندازہ کیجئے جس میں میں بامروت ادیب جلتا رہتا ہوں اور جل نہیں چکتا۔

ایک صاحب ہیں جن کے علاقے میں میرا مکان ہے۔ میں اُن کے لئے سیاسی، معاشی، تجارتی، علمی، ادبی، فلمی اور جانے کیسی کیسی تقریریں لکھتا ہوں۔ مگر نہ لکھوں تو وہ مجھے اپنے مزارعوں سے اٹھوالیں، اُن کی فرمائش کا انداز دیکھئے۔

فون کی گھنٹی بجی

"کون؟"

"میں ـــــــ بول رہا ہوں"

"جی! حکم؟"

"فلاں صاحب آ رہے ہیں۔ بس ابھی آدھ گھنٹے میں تقریر لکھ دیں، جو شیلے شعر بھی ڈال دیں۔ ملازم بیس منٹ میں آ کر لے جائے گا"

"جی! بہتر تعمیل ارشاد کر رہا ہوں"

ایک دن خود آ گئے۔ یہ لمبی چمکیلی کار پتہ نہیں شیورلیٹ کہ پجارو (میں بدبخت تو اُس موٹر سائیکل سے زیادہ علم ہی نہیں رکھتا جسے پھٹ پھٹی کہتے ہیں) تین خوفناک مونچھوں والے ملازم ہمراہ، میں نے جھک کر سلام کیا۔ بیٹھک کا دروازہ کھولا۔ چند فقروں میں اُن کی تشریف آوری اور عزت بخشی کا اظہار کیا اور دست بستہ عرض کی "حکم؟"

ارشاد ہوا "بس ابھی تقریر لکھو میں لے کر جاؤں گا، یہ Points ہیں۔ پُر جوش لکھنی ہے، کم از کم بیس اشعار شامل کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "تقریر ابھی لکھتا ہوں لیکن اشعار تو یاد نہیں"

فرمایا "خود گھڑ لو"۔

میں نے کہا "شعر کی اپنی مرضی ہوتی ہے۔ آئے تو اب آئے نہیں تو ہفتے تک نہ آئے" "نہ جی! کیسے نہ آئے۔ اُسے آنا پڑے گا۔ آپ دوسرے کمرے میں جا کر گھڑ لیں اتنے ہمارے لئے چائے فروٹ وغیرہ منگوا دیں۔ ابھی لے کر جانی ہے، تقریر بس اتنی شاندار ہو کر چالفوں کے چھکے چھوٹ جائیں۔"

دروازے پر دستک

"صاحب! یہ آپ کے دوست کا رقعہ ہے۔ کاکے کو کل پاکستان مقابلہ تقاریر میں شامل ہونا ہے، یہ ٹاپک ہے۔ کل تک فرسٹ کلاس تقریر چاہیے"۔

"بہت اچھا"

ٹیلیفون! "ہیلو"

"ہیلو! میں عبدالصمد خاں بول رہا ہوں۔ ایک تقریر۔ دھوبیوں کا جلسہ ہے، بہترین صدارتی تقریر"۔

"بہت اچھا"

کار کے ہارن کی آواز،

"آیئے آیئے ملک صاحب"

"جناب! ایک ڈی بیٹ لاہور میں ہو رہی ہے آپ کا بھتیجا (سلام کرانکل کو) حاضر ہے، ایسی تقریر لکھ دیجئے کہ فرسٹ پرائز لائے بلکہ ٹیم ٹرافی لائے"

رات کے گیارہ بجے ہیں۔ میٹھی میٹھی نیند آنکھوں میں رس گھول رہی ہے۔ فون کی کرخت آواز

"ہیلو"

"میں آپ کا دوست بول رہا ہوں۔ کل شام سکول کا سالانہ جلسہ ہے۔ آپ شرکت کریں گے نا؟"

"آپ بلا رہے ہیں تو ضرور آؤں گا"

"اچھا ایک گزارش ہے بلکہ دو گزارشیں"

"حکم"

"میرے لئے سپاس نامہ لکھ دو۔ صدر کی خدمت میں پڑھوں گا"۔

"منظور دوسری گزارش؟"

"صدر کے لئے ایک صدارتی خطبہ بھی لکھ دو"

"نامنظور"

"نہیں بھائی! ایسا نہ کرو۔ اُس نے ہزار روپیہ مصارف کے لئے دیا ہے"

"مجھے اس رقم میں سے تقریر لکھوائی کا کتنا ملے گا؟"

"یار! مذاق چھوڑو۔ لکھ دو! تمہیں میری جان کی قسم"

"تم خود کیوں نہیں لکھ لیتے۔ آخر ہیڈ ماسٹر ہو"

"نہیں یار! تم سے بہتر کون لکھ سکتا ہے تم تو موتی ٹانکتے ہو۔ پھول سجاتے ہو تمہیں خدا کی قسم! رسول اللہ کی قسم لکھ دو۔"

"جی بہتر۔ دونوں تقریریں کل لے لیجئے"۔

اگلی صبح وہ آئے۔ دونوں تقریریں نذر کر دیں۔ پڑھیں، بہت خوش ہوئے۔ حمد تحریر کی داد دی اور فرمایا۔ "یہ دوسری تقریر ابھی ارجمند خان کو پہنچا دوں گا"۔

"یہ ارجمند خان کون؟

"آج کے صدر جلسہ"

جلسہ منعقد ہوا۔ ارجمند خان مسند صدارت کی زینت بنے۔ مجھ سے شناسائی تھی میں اگلے صوفے پر بیٹھا تھا۔ جلسے کی کاروئی شروع ہوئی، پروگرام پیش ہوا آخر میں صدر صاحب نے وہی تقریر جیب سے نکالی جو اس نیاز مند کی دماغ سوزی اور عرق ریزی کا نتیجہ تھی۔ خوب لہک لہک کر پڑھی بڑی داد ملی' جلسہ ختم ہوا۔ صدر صاحب مسند سے اتر میرے پاس آبیٹھے اور آتے ہی پوچھا "کیسی تقریر تھی میری؟"

"بہت عمدہ تھی بہت دلکش سبحان اللہ" "رات میں نے بڑی محنت سے لکھی تھی"۔ صدر صاحب نے فرمایا' میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے ارجمند خان صاحب' صدر جلسہ کو دیکھنے لگا۔ اُن کا چہرہ داد و تحسین سے گلنار تھا اور میرے چہرے پر پھٹکار برس رہی تھی۔

تعاون کیلئے التماس

ہم اپنے محترم قلمی معاونین سے ملتمس ہیں کہ وہ اپنی نگارشات نظم و نثر یا تو ٹائپ شدہ صورت میں ارسال فرمائیں یا وہ قدرے احتیاط سے تحریر کردہ ہوں۔ تاکہ پڑھنے میں دشواری نہ ہو کیونکہ ہماری انتہائی کوشش ہوتی ہے کہ "الاقرباء" کے مندرجات اغلاط سے پاک ہوں اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہمیں آپ کا گرانقدر تعاون حاصل ہو۔ (ادارہ)

خاکہ

پروفیسر محسن احسان

"میں نے جو کچھ بھی کہا"

(ذوالفقار بخاری کی غزلیں)

ذوالفقار علی بخاری اور پطرس بخاری کو اردو شناس طبقے میں شاید ہی کوئی ہو جو نہ جانتا ہو۔ ان دونوں فرزندان پشاور نے فکر و خیال اور نشر و اشاعت کی دنیا میں وہ نام کمایا جس کی رسائی کیلئے بہت سے اہل علم و بصیرت ترستے ہیں۔ دونوں بھائیوں کو ان کا حلقہ احباب صحیح بخاری (پطرس) اور غلط بخاری (ذوالفقار) کے نام سے یاد کرتا ہے۔ اب دونوں اس جہان میں نہیں ہیں مگر دونوں کا براڈ کاسٹنگ اور اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج میں جو حصہ ہے وہ ناقابل فراموش ہے۔

پطرس بخاری تو پطرس کے مضامین لکھ کر مزاح کی دنیا میں امر ہو گئے۔ پھر آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل کی حیثیت سے پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور اقوام متحدہ میں پاکستان کے مستقل مندوب اور انگریزی زبان و ادب پر عبور کے حوالے سے وہ لافانی نقوش چھوڑ گئے کہ اقوام متحدہ کے در و دیوار اب تک اس کے گواہ ہیں۔ ذوالفقار علی بخاری نے ماہر براڈ کاسٹر دلی، بمبئی بی بی سی اور ریڈیو پاکستان کی طویل اعلیٰ خدمات کے علاوہ شاعر اور نثر نگار (بحوالہ سرگزشت) شہرت کے دوامی دربار میں جگہ پائی۔ اپنی آواز کی گرج اور اپنے لہجے کے طمطراق سے ہر ادبی حلقے میں مقبول و محترم ہوئے۔ مرزا ظفر الحسن نے لکھا ہے کہ بخاری صاحب اپنی ملازمت کے پہلے دن ڈرامائی لباس پہنے ۱۸ علی پور روڈ دلی والے ریڈیو اسٹیشن میں داخل ہوئے اور ۲۳ سال ملازمت کرنے کے بعد ڈرامائی انداز سے براڈ کاسٹنگ ہاؤس کراچی کی ملازمت کے آخری دن رخصت ہوئے۔

زیڈ اے بخاری کا غزلیات پر مشتمل مجموعہ "میں نے جو کچھ بھی کہا" بخاری صاحب کی وفات ۱۲ جولائی ۱۹۷۵ء کے تقریباً اٹھائیس برس بعد احمد فراز نے نیشنل بک فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام شائع کیا۔ بخاری صاحب فراز کو اپنے ساتھ ۷۹-۱۹۷۸ء میں کراچی لے گئے تھے۔ جہاں اسے سکرپٹ رائٹر کی حیثیت سے ریڈیو پاکستان میں ملازمت دی۔ اس پر نگاہ کرم رکھی اور ہر اعتبار سے تربیت کی۔ بخاری صاحب کی شدید خواہش تھی کہ مجموعہ کلام ان کی زندگی میں چھپتا لیکن وقت کی بے رحمی اور حالات کا جبر و ستم آڑے آتا رہا۔ ان

کی بیاض پر کیا کیا گزری یہ ایک طویل کہانی ہے۔ مگر اس کہانی کا انجام بخیر کہ یہ بیاض بالآخر زیور طبع سے آراستہ ہوگئی۔ فیض احمد فیض کی ایک گفتگو "آزاد مرد" کے عنوان سے اس میں شامل ہے۔ جس میں بخاری صاحب کے ساتھ اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ "بڑے بھائی بے حد فہیم اور دانشمند تھے۔ ان کی فراست اتنی تیز تھی کہ مجھے کسی اور شخصیت میں آج تک نظر نہ آئی۔ چھوٹے بخاری صاحب کی ذہانت عوامی بھی تھی اور عملی بھی' دربار کے دونوں قائل تھے اور دونوں نے اپنے اپنے دربار سجائے مگر بڑے بھائی ہر ایک سے کھلتے نہیں تھے۔ ان کے مخصوص و محدود احباب اور رفیق تھے وہی ان کے اطراف ہالہ بناتے رہتے تھے۔ ان کے دربار خاص میں ہر ایک کی رسائی ممکن نہ تھی۔ چھوٹے بخاری صاحب کا دربار عام تھا۔ افسر بھی موجود اہلکار بھی حاضر' شاعر بھی آتے ہیں' ادیب بھی بیٹھے ہیں گلوکار بھی اور سازکار بھی۔ مصور بھی محتاج و غنی بھی' دروازہ کسی پر بند نہیں ہنگامہ آرائی' فقرہ بازی اور دمادم مست قلندر قسم کی محفلیں سجانا دونوں کے خمیر میں تھا مگر بڑے بھائی جو کرتے اپنے خاص حلقے میں کرتے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔ چھوٹے بھائی سر بازار کرنے سے بھی نہ چوکتے۔ شہر میں اس کی دھوم مچ جاتی حکمران کے کانوں پر جوں بھی نہ رینگتی۔۔۔۔ رعب دونوں کا تھا۔ دوستی اور بے تکلفی کے باوجود بڑے بخاری صاحب کا رعب بہت تھا اور مستقل تھا۔ یہ نہیں کہ صبح مرعوب ہوئے شام رعب ختم۔ چھوٹے بھائی بہت جلد شگفتہ مزاج ہو جاتے' گھل مل جاتے۔ اس لئے ان کا رعب عارضی تھا کوئی خاص خوف طاری نہیں ہوتا تھا"۔ فیض صاحب کا یہ تجزیہ بڑے بھائی اور چھوٹے بھائی کی شخصیتوں' ذاتی اوصاف' مزاجوں کے تضاد اور طبیعتوں کے اختلاف کے بارے میں تھا اب ان دونوں کی علمیت اور فکر و نظر کی گہرائی کے بارے میں بھی سن لیجئے ۔۔۔ فیض صاحب لکھتے ہیں "علم کے معاملے میں دونوں بھائی استاد سے کم نہ تھے۔ بڑے بخاری صاحب کا انگریزی اور مغربی ادب کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ انگریزی پر ان کے عبور کا یہ عالم تھا کہ زبان کے بنیادی اصولوں' محاوروں' روزمرہ اور لغت کے معاملات میں انگریز بھی کم ہی ان کی ہمسری کا دعویٰ کر سکتا تھا۔ چھوٹے بخاری نے اپنی توجہ اردو اور فارسی کی طرف رکھی۔ ان کا طریقہ بھی صرف زبان کے فرق سے وہی تھا جو بڑے بخاری صاحب کا تھا۔ یعنی بال کی کھال اتارنا' تلفظ' املا' ماخذ' معنی غرض ہر بات میں کمال دونوں اہل زبان کو مات کرتے تھے۔ وہ انگریزی کے اہل زبان کو مات کرتے تھے یہ اردو کے اہل زبان کو ۔۔۔ زبان کے بارے میں تجسس اور تحقیق دونوں کی گھٹی میں پڑی تھی"۔ فیض صاحب کے اس اقتباس سے دونوں بھائی کی افتاد طبع کا فرق نمایاں ہے۔ لیکن دونوں نے اپنے اپنے فن میں کمال

حاصل کیا۔ شعر گوئی بڑے بھائی بھی کرتے تھے چھوٹے بھی۔۔۔ان کے علاوہ تیسرے بھائی رفعت بخاری کو بھی شعر کہنے میں ملکہ حاصل تھا۔ ان کا غیر مطبوعہ کلام موجود ہے۔ احمد فراز نے "وہ جو قرض رکھتے تھے جان پر" میں ذوالفقار بخاری کی شعر گوئی اور زود گوئی کے حوالے سے اپنے ذاتی مشاہدے کی بنا پر بعض عجیب انکشافات کیے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں "بخاری صاحب شعر کیسے کہتے تھے اس سے نہ صرف ان کی قادر الکلامی کا سراغ ملتا ہے بلکہ ان کے طریقہ واردات کا بھید بھی کھلتا ہے۔ واردات کا لفظ میں نے ارادتاً استعمال کیا ہے۔ اچھی شاعری کا تعلق واردات قلبی سے ہے لیکن بخاری صاحب کی بیشتر غزلیں شعر سازی کے زمرے میں آتی ہیں۔ وہ دامن شعر کو حریفانہ کھینچتے تھے اور شعر کھنچا چلا آتا تھا۔ مگر میرے مشاہدے کے مطابق ان کا طریقہ واردات میں نے نہ ان سے پہلے نہ ان کے بعد دیکھا اور نہ سنا۔ شام ہوئی تو ان کے گھر ابھی محشر بدایونی آئے تو ان کے ساتھ ہی ارم لکھنوی بھی مجسم لکھنوی تہذیب بنے جھک جھک کر آداب کرتے کرتے داخل ہوئے۔ چند لمحوں بعد رشید تبسم اپنے تن و توش کا بار گراں اٹھائے موجود دوستوں سے مصافحہ کرتے کسی خالی کرسی میں دھنس جاتے تو حمید نسیم بھی کالی شیروانی پہنے پہنچ گئے۔ تھوڑی دیر میں قاضی احمد سعید لجاتے ہوئے بخاری صاحب کے جملے سے پہلے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے اپنی جگہ بنا لیتے۔ اس طرح دو چار مجلسی رفوگر بھی خوشامد کی گوٹہ کناری اور روغن قاز کی بوتلیں لیے پہنچ جاتے اور دربار کا سماں پیدا ہو جاتا۔ بخاری صاحب خود بخود میر مجلس ہو جاتے اور کسی نہ کسی بات کسی نہ کسی واقعہ پر سلسلہ گفتگو کا آغاز ہو جاتا کہ اتنے میں محشر کہتے قبلہ آج سید آل رضا کے ہاں محفل مشاعرہ بھی ہے۔ بخاری صاحب کہتے او ہو کب ہے؟ یہی کوئی نو بجے کا وقت دیا ہے۔

خیر ابھی گھنٹہ ہے۔ بخاری صاحب موٹی سی رسٹ واچ پر نظر ڈالتے ہوئے کہتے کونسی غزل پڑھی جائے۔ جی مشاعرہ طرحی ہے "ارے!" بخاری صاحب چونک کر کہتے مصرعہ کیا ہے۔ محشر کہتے "محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی" اور بخاری صاحب ادھر ادھر دیکھنے لگتے۔ ہاں قاضی کوئی قافیہ دو۔۔۔ اور قاضی صاحب جھٹ سے کہتے خدا۔۔۔ بخاری کہتے ارے قاضی خدا کا خوف کرو۔ یہ خدا ہو جائے گی کیسے ہوگا" قاضی صاحب پھر کہتے کیسے ہوگا یہ آپ کا مسئلہ ہے اور ایک آدھ رفوگر بول اٹھتا۔ جی حضور کے ذہن میں "خلق خدا ہو جائے گی" ضرور آیا ہوگا۔ بخاری صاحب کچھ دیر آنکھیں بند کر لیتے۔ سگریٹ کے دو تین کش لگاتے، ہوں ہوں ہوں کرتے اور گنگناتے ہوئے اچانک کہتے محشر لکھو اور محشر بدایونی سودا کے میاں غنچے کی طرح لکھنے کے ساتھ ساتھ سبحان اللہ جزاک اللہ کہتے جاتے۔

بخاری صاحب پھر گویا ہوئے حمید کوئی قافیہ دو حمید نسیم وفا کا قافیہ دیتے اور پھر وہی منظر۔ اس طرح حاضرین محفل قافیہ دیتے اور بخاری صاحب اپنی گھنی اور سفید بھویں اٹھاتے اور محشر سے بولتے "کتنے شعر ہو گئے" محشر گنتے اور کہتے نو شعر ہو گئے اور بخاری کہتے چلو غزل ہو گئی اور اس طرح بخاری صاحب کے سارے حواری گاڑی میں ٹھس ٹھسا کر جائے مشاعرہ کی طرف روانہ ہو جاتے"۔

اس اقتباس سے بخاری صاحب کی زود گوئی اور سخن آرائی کے علاوہ ان کے اردگرد جمع ہونے والوں کے مزاج، عادات اور رویوں کا سراغ بھی ملتا تھا۔ وہ ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل تھے اور ریڈیو میں ایسے لوگوں کی کمی کبھی نہیں رہی جو اپنی چرب زبانی، کاسہ لیسی اور چاپلوسی سے افسران بالا کی محفل خاص میں پہنچ جاتے اور بلند اقبالی اور طالع مندی سے سرفراز ہوتے۔ بخاری صاحب تو خیر بخاری صاحب تھے۔ ان کا جاہ و جلال اور رعب و دبدبہ اپنی جگہ، مجھے تو ان سے کم تر افسروں کے اردگرد بھی طالع آزماؤں کے حلقے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ بخاری صاحب اردو فارسی شاعری پر گہری نظر رکھتے تھے، مائیکروفون کے بادشاہ تھے۔ ان کی آواز میں دبدبہ بھی تھا، حسن بھی تھا، صفائی بھی تھی اور دل پر اتر جانے کا اسلوب بھی--- وہ مرثیہ پڑھتے تو ایسے لگتا کہ لفظوں میں تصویریں اتر آئی ہیں۔

گرمی کا منظر ہوتا کہ جنگ کا، حضرت حسینؓ کی تلوار کا تذکرہ ہوتا کہ حضرت عباسؓ کے راہوار کا--- مصرعے کی ادائیگی بتاتی کہ اگر انیس بھی ہوتا تو وہ بھی بخاری صاحب کی مرثیہ خوانی سنکر ضرور داد و تحسین دیتا۔ پشاور میں ضیا جعفری کے گھر ناشتہ پر اکثر آتے، احباب پشاور کی فرمائش پر مرثیہ بھی پڑھتے اور محفل لوٹ کر لے جاتے۔ ان کے سامنے کسی کو سخن کی مجال نہ ہوتی تھی۔ دوسری مرتبہ میں نے انہیں کھارادر کے امام باڑہ میں مرثیہ پڑھتے سنا تھا۔ ہال بھرا ہوا تھا۔ بخاری صاحب سفید ململ کے کرتے پاجامے میں تھے۔ کراچی کی تمام محترم اور معتبر ہستیاں موجود تھیں۔ بخاری صاحب مرثیہ پڑھتے رہے اور داد و تحسین کے ڈونگرے برستے رہے۔ میں اس محفل کو نہیں بھلا سکتا۔ اس مرثیہ خوانی کی مجلس میں نصیر ترابی مجھے لیکر گئے تھے۔ اس محفل میں ڈاکٹر محمود حسین، ہاشم رضا، ناصر جہاں، بشیر کاظمی، انصار ناصری کے علاوہ کراچی کی اکثر علمی ادبی شخصیتیں موجود تھیں اور وہ لوگ بھی حاضر تھے جو ہر وقت ان کے اشارے کے منتظر رہتے تھے۔ احمد فراز نے بڑے دکھ سے یہ لکھا ہے کہ "ریٹائرمنٹ کے بعد وہ دوستوں کو ترس گئے تھے، کبھی کبھی کوئی مزاج پرسی کو آ جاتا تو بخاری صاحب خوش ہو جاتے ورنہ ان کا دیوان خانہ غالب کے قطعہ "ظلمت کدے میں میرے شب غم کا جوش ہے" کی تصویر

تھا"۔ اسی دکھ کا اظہار بخاری صاحب نے اپنے ایک شعر میں یوں کیا تھا

اب مرے حلقۂ احباب میں کون آتا ہے — شمع کشتہ کی ضرورت نہیں پروانوں کو

ہمارے دل کو بہت انفعال ہوتا ہے — ہماری چشم سے گر چشم دوستاں نہ ملے

تری محفل بہت اچھی ہے لیکن ہائے وہ محفل — وہ کیا محفل تھی جس محفل میں جان دوستاں ہم تھے

میرے احباب سے جا کر کوئی اتنا پوچھے — غیر ہو جائینگے احباب تو پھر کیا ہوگا

بخاری صاحب بحیثیت شاعر زود گو نہیں تھے لیکن ضرورت کے پیش نظر یا مشاعرے میں شرکت کے لئے مصرع طرح پر غزل کہہ لینے کا ہنر جانتے تھے۔ ان کی غزل کی تکمیل قافیہ کے ہاتھ میں رہتی تھی۔ قافیہ جدھر چاہتا یہ خیال کو بھی آسانی سے ادھر موڑ لیتے تھے۔ قافیے کی رعایت سے جو خیالات ان کے ذہن میں آتے تھے وہ شعر کے سانچے میں ڈھل جاتے تھے۔ ایسے بھی لگتا ہے کہ ان کی غزلوں میں مصرع ثانی میں جو مضمون باندھا گیا اسی کی رعایت سے مصرعہ اول کا مضمون بھی ادا کر دیا گیا۔ لیکن خیال کی بندش اور الفاظ کی ادائیگی شعر میں حسن پیدا کر دیتی تھی۔

مداوا درد دل کا میرے مٹ جانے سے کیا ہوگا — حقیقت سے نہیں ہوتا تو افسانے سے کیا ہوگا

یہ آبادی کو ویرانہ بنانے لوٹ آئے ہیں — نہیں تو پھر دیوانوں کو ویرانے سے کیا ہوگا

دل نے نہ پایا اپنا ٹھکانہ — یہ آستانہ وہ آستانہ

دنیا حقیقت عقبیٰ فسانہ — لاؤ کہاں ہے چنگ و چغانہ

صیاد صیاد صیاد صیاد — یہ اک قفس ہے یا آشیانہ

بیناوک افگن وہ ناوک افگن — دل ہے نشانہ دل ہے نشانہ

نام پایا ہے نام سے پہلے — کام آیا ہوں کام سے پہلے

صبح ہوتی ہے شام سے پہلے — رہ گزر ہے مقام سے پہلے

شب فرقت کی آمد آمد ہے — شام ہوتی ہے شام سے پہلے

یہ فصل دور طرب میں شمار کیا ہوگی — ترے بغیر ہماری بہار کیا ہوگی

بخاری صاحب کے دور میں ترقی پسند تحریک کا بڑا چرچا تھا۔ لیکن بخاری صاحب کی اس سے کوئی ذہنی ہم آہنگی نہیں تھی۔ نہ انہوں نے کبھی ترقی پسند شعراء کی ہنگامی شاعری کے بارے میں کوئی مثبت رائے قائم کی۔ ان کی غزل میں ادبی صداقت کا صاف و شفاف ماحول جگمگاتا ہے۔ تخلیقی سفر میں ظاہر و باطن سے رشتہ استوار رکھا ہے۔ جذبات و احساسات و خیلات و تجربات کا دلکش سرمایہ ان کے فن میں ہوتا ہے۔ ادبی دنیا کے بہت سے نشیب و فراز بخاری صاحب نے دیکھے مگر کسی غیر ضروری روش نے ان کے شعری خراج کو متاثر نہیں کیا۔ ان کی غزل ان کے محسوسات حقیقی کی ترجمانی کرتی ہے اور اقدار حیات کی بقا اور سربلندی کی آئینہ دار ہے۔ ان کے ہاں انسان کے اجتماعی دکھ، کم مائیگی، تنہائی اور پریشان حالی کی بعض دلدوز تصویریں بھی اشعار کے چوکھٹے میں جڑی ہوئی ہیں۔

صدمۂ غم دل غم دوست سے کم پہنچا ہے — اور پہنچا ہے تو از راہ کرم پہنچا ہے
میری جانب سے اسے تحفۂ دعا کی پہنچے — جس کی جانب سے مجھے تحفۂ غم پہنچا ہے

یا

یکساں ہے ہر اک بندۂ یزداں مرے نزدیک — اس درجہ کہ دشمن بھی ہے انساں مرے نزدیک

مہر و ماہ و انجم کی بے نیازیاں توبہ — دوست ہو کہ دشمن ہو آدمی غنیمت ہے

اس کا احوال فرشتے ہی بتا سکتے ہیں — بات بھی جس نے نہ پوچھی کبھی انسانوں کی

میرے حریم عشق میں ایک بھی غزنوی نہیں — اور ہزار ہا صنم حسن کے سومنات میں

مجھ کو دریا ملے پایاب تو پھر کیا ہوگا — اور ہو جاؤں میں غرقاب تو پھر کیا ہوگا

سفر حرم سے مجھ کو نہ ملی حرم کی منزل — یہ سفر سفر نہیں تھا کہ حرم حرم نہیں ہے

میرے عرفاں کی فرشتے بھی قسم کھاتے ہیں — عشق کو علم سمجھتا ہوں خدا کو معلوم

اگر سنتا کوئی تو داستاں در داستاں ہم تھے — کہ سر دلبراں ہم تھے حدیث دیگراں ہم تھے

بخاری صاحب غزل کی تہذیب اور مزاج سے واقفیت رکھتے تھے۔ یہ اچھا ہوا کہ انہوں نے منہ کا مزا بدلنے کے لئے کوئی تجربہ نہیں کیا۔ ورنہ ساٹھ اور ستر کی دہائی میں ایک اینٹی غزل کے نام سے منسوب تحریک بھی چلی تھی مگر سنجیدہ طبع، روایات و اقدار پسند اور عمیق نظر رکھنے والے اصحاب نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی

یہی حال آزاد غزل کا ہوا کہ یہ بھی اپنی موت آپ مر گئی اور غزل مقبولیت اور ہر دلعزیزی کی منزلیں طے کرتی چلی گئی اور آج اس مقام پر ہے کہ اس صنف سخن کے بغیر کسی شاعر کی پہچان ممکن نہیں۔ بخاری صاحب نے اہم سرکاری مصروفیات کے باوجود شوق سخن اور مشق وریاضت کو جاری رکھا۔ ان کے ہاں الفاظ پر قدرت محاورات کا برمحل استعمال، تشبیہات واستعارات کی چمک دمک تو دکھائی دیتی ہے لیکن جذبہ اور احساس کی تھرتھراہٹ میں وہ زور وشور نظر نہیں آتا جو ذہین اور ہونہار شعرا کی فکری صلاحیتوں اور شعری توانائیوں میں ملتا ہے۔ بخاری صاحب کے مخصوص انداز کے یہ اشعار دیکھیے۔

یکساں ہے ہر اک بندۂ یزداں مرے نزدیک   اس درجہ کہ دشمن بھی ہے انساں میرے نزدیک
ایماں کی جگہ کفر ہی بن جائے نہ ایماں   آ اور بھی غارت گر ایماں نزدیک

قیام قافلۂ صبح و شام ہو تو سہی   کہیں قیام ہو لیکن قیام ہو تو سہی
ہر اک جہان سے آگے جہان ملتا ہے   تمام یہ سفر نا تمام ہو تو سہی

مجھے گناہوں کے تجربوں سے نکالنی ہیں ہزار باتیں   ابھی سے روز شمار کیسا ابھی تو ہیں بے شمار باتیں

مجھ کو نہ خزاں سے نہ بہاراں سے گلہ ہے   رنگ و روش اہل گلستاں سے گلہ ہے
آغاز کو انجام سمجھ بیٹھا تھا ناداں   کم بخت دل زود پشیماں سے گلہ ہے
یزداں سے الجھ جائے تو کچھ بات سمجھ جائے   انسانوں کو الجھے ہوئے انساں سے گلہ ہے

سراج اورنگ آبادی کی مشہور زمانہ غزل

خبر تحیر عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی   نہ وہ تو رہا نہ وہ میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی

اس زمین میں بہت سے اہم شعرا کی غزلیں ہیں۔ بخاری صاحب نے بھی طبع آزمائی کی۔ ان کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

وہی میری دربدری رہی وہی تیری جلوہ گری رہی   تری بزم میرے خیال میں نہ سجی رہی نہ بھری رہی
چلی شہر عشق میں ہوا کہ وہ ذوق وشوق ہی مٹ گیا   نہ پری زدہ وہ جنوں رہا نہ جنوں زدہ وہ پری رہی
یہ جہان خرمن و برق ہے مگر آگ آگ میں فرق ہے   تری برق حسن کی آگ سے مری کشت عشق ہری رہی
بھری بزم سے جو اٹھا دیا تو ہمارا حرج ہی کیا ہوا   کہ نکل کے باغ ارم سے بھی وہی عظمت بشری رہی
اسے امن کہتے ہیں یا خلل نہوئی عقل گم ہوئے ہاتھ شل   نہ جنوں کی سنگ زنی رہی نہ خرد کی شیشہ گری رہی

نہ تجھی کو کوئی مزہ ملا نہ مجھی کو ہو سکا فائدہ　　وہی تیری کم نظری رہی وہی میری بے ہنری رہی

یہ اور بہت سے دیگر اشعار بخاری صاحب کے عشق و محبت کی لطیف اداؤں کے محرم راز ہونیکا سراغ دیتے ہیں۔ ان کا عشق ایسا عشق نہیں جو بزدلی، کم ہمتی، پست خیالی اور نفس پرستی کی ترجمانی کرتا ہو۔ وہ نامانوس لفظوں پیچیدہ تراکیب اور بعید از فہم استعاروں سے ہمیشہ گریز کرتے رہے ان کی ایک غزل ان کی یاد ماضی کی بے حد خوبصورت آئینہ داری کرتی ہے کچھ شعر سنتے چلیئے:

اے میرے شہر سے آنے والے کچھ تو کہو ہاں کچھ تو کہو
اس شہر کے گھر آباد ہیں یا آباد ہیں زنداں، کچھ تو کہو
دامن کے چاک سے دور ہے کتنا چاک گریباں کچھ تو کہو
یا اب کے بھی بے صرف گزاری فصل بہاراں کچھ تو کہو
کیا صبح کو اب بھی باد صبا پیغام محبت لاتی ہے
کیا شام کو اب بھی لہراتی ہے کاکل پیچاں کچھ تو کہو
وہ گاؤں کا اونچا ٹیلہ جس پر شام کو پریاں آتی تھیں
کیا اپنی جگہ پر قائم ہے وہ تخت سلیماں کچھ تو کہو
وہ شہر کا واعظ جو ہر ایک پر کفر کا فتویٰ جڑتا تھا
کس حال میں ہے وہ مرد خدا اے مرد مسلماں کچھ تو کہو
کیا زلف کا مضموں باندھتے ہیں یا پاؤں پڑی زنجیروں کا
کس فکر میں غلطاں پیچاں ہیں یاران غزل خواں کچھ تو کہو
کیا آگ لگی اب مٹی میں کیا زہر گھلا اب پانی میں
کیوں قحط لگاتی رہتی ہے اب محنت دہقاں کچھ تو کہو
ہاں موت سبھی کو آنی ہے ہم سب کو مرنا ہے لیکن
اس شہر میں زندہ رہنے کا بھی کوئی ہے امکاں کچھ تو کہو

یہ پوری غزل ایک خوبصورت تسلسل کے ساتھ وجود میں آئی ہے اور بخاری صاحب کے ناسٹلجیا کا بھرپور اظہار ہے۔

خاکہ

عبدالحمید اعظمی

یہ مقامِ خنک جہنم ہے

حیدرآباد سے میرپور خاص جانے والی شاہراہ پر زرعی یونیورسٹی سے ذرا آگے ایک بزرگ کا مزار ہے۔ اتنا بڑا نہیں کہ آپ رک جائیں اتنا چھوٹا نہیں کہ نظر نہ آئے۔ یہ مزار اطراف و جوانب کے لوگوں کی عقیدت کا مرکز ہے۔ روایت کے مطابق ان بزرگ کا نام آتو فقیر ہے۔ عقیدت مندوں نے بتایا کہ آتو فقیر مادرزاد ولی تھے۔ اس زمانے میں تھے جب تمباکو کی مقبولیت دور دراز دیہات تک پہنچ چکی تھی۔ لیکن دیا سلائی سے لوگ آشنا نہیں تھے۔ اسی لئے آگ کو نہایت احتیاط سے محفوظ رکھا جاتا تھا۔ خصوصاً رات میں دہکتے کوئلوں کو گرم گرم بھوبھل میں اس طرح دبا دیا جاتا تھا کہ وہ صبح تک بجھتے نہیں تھے۔ آگ کا زیادہ استعمال حقہ پینے والے کرتے تھے۔ اگر رات میں کسی وجہ سے آگ بجھ جاتی تھی اور اڑوس پڑوس سے مانگنے میں کوئی عار نہ ہوتا۔ چونکہ آتو فقیر کی والدہ بھی حقے کی رسیا تھیں اس لئے رات میں آگ سنبھال کر رکھی جاتی تھی۔ ایک روز وہ جب صبح سویرے اٹھیں تو دیکھا کہ نہ کوئلہ ہے نہ انگارہ' تمباکو کی طلب نے زیادہ ستایا تو ننھے آتو سے بولیں بیٹے دوڑ کر جا پڑوس سے آگ لا۔ آتو نے اڑوس پڑوس کے تمام گھروں پر دستک دی لیکن آگ نہ ملی۔ اس تلاش میں کچھ وقت لگا۔ والدہ کی چلم تو ٹھنڈی رہی لیکن آنکھوں سے چنگاریاں برسنے لگیں۔ آتو خالی ہاتھ آئے تو مارے غصے کے بولیں۔ پڑوس سے آگ نہیں ملی تو جہنم سے لے آ۔ آتو گھر سے نکل گئے۔ تھوڑی دیر بعد لوٹے۔ اور بڑی لجاجت سے بولے ماں میں جہنم گیا تھا وہاں بھی آگ نہیں تھی۔ جہنم کے داروغہ نے کہا پگلے بچے آگ یہاں کہاں۔ ماں نے کہا یہ کیا بکواس ہے۔ ماں سچ کہتا ہوں جہنم تو ٹھنڈی جگہ ہے وہاں جو آتا ہے آگ اپنے ساتھ لاتا ہے۔

آتو فقیر سے منسوب یہ واقعہ ذرا سی تبدیلی کے بعد تذکرہ غوثیہ میں بھی بیان ہوا ہے۔ جسے ممتاز مفتی کی آخری فکر انگیز کتاب "تلاش" میں ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے۔

"پہاڑ کی کھوہ میں ایک فقیر رہتا تھا۔ جو دن رات عبادت میں مصروف رہتا تھا۔ اسکے ساتھ اس کا بالکا بھی تھا۔ فقیر حقہ پینے کا شوقین تھا۔ اس نے اپنے بالکے کو حکم دے رکھا تھا کہ ہر وقت آگ کا انتظام رکھے۔

ایک روز آدھی رات کے وقت فقیر نے بالکے کو حکم دیا کہ چلم بھر دے۔ بالکے نے دیکھا بارش کی وجہ سے آگ بجھ چکی تھی۔ اتفاق سے ماچس بھی ختم ہو چکی تھی۔ بالکا گھبرا گیا۔ اب کیا کرے؟ اس نے فقیر سے کہا عالی جاہ آگ تو بجھ چکی ہے۔ ماچس نہیں ہے کہ سلگاؤں۔ فرمایئے کیا کروں۔ فقیر جلال میں بولا۔ ہم تو چلم پئیں گے چاہے آگ جہنم سے لاؤ۔

بالکا چل پڑا۔ چلتے چلتے جہنم جا پہنچا۔ دیکھا کہ جہنم کے صدر دروازے پر ایک چوکیدار بیٹھا اونگھ رہا ہے۔ بالکے نے اسے جھنجھوڑا اور پوچھا کیا جہنم کا یہی دروازہ ہے۔

"چوکیدار بولا ہاں جہنم کا یہی دروازہ ہے۔

بالکا بولا لیکن یہاں تو آگ دکھائی نہیں دیتی۔

چوکیدار نے کہا ہر جہنمی اپنی آگ اپنے ساتھ لاتا ہے۔"

اسی خیال کو علامہ اقبال نے بانگ درا کی نظم سیر فلک کا نقطۂ عروج بنایا ہے۔ فرشتے کے ہمراہ جنت کی سیر کرتے ہیں اس کے بعد فرشتہ انہیں دوزخ کی سیر کے لئے لے جاتا ہے۔ جو عام سے عقیدے کے برخلاف ٹھنڈا مقام ہوتا ہے۔ اقبال حیران ہوتے ہیں اور پکار اٹھتے ہیں۔

یہ مقامِ خنک جہنم ہے	نار سے نور سے تہی آغوش
شعلے ہوتے ہیں مستعار اسکے	جن سے لرزاں ہے مرد عبرت کوش
اہل دنیا یہاں جو آتے ہیں	اپنے انگارے ساتھ لاتے ہیں

دوزخ کے بارے میں یہ خیال محض اتفاقی ہے یا توارد کا ثمر ہے یا اہل اللہ کا مشاہدہ ہے یا یہ روایت اقبال تک پہونچی اور انہوں نے اس خیال کی ندرت سے متاثر ہو کر اسے منظوم واقعاتی صورت میں پیش کر دیا۔

یہ حقیقت قابل غور ہے کہ اقبال جب ایسا کوئی واقعہ نظم کرتے ہیں تو اس کے راوی کا ذکر ضرور کر دیتے ہیں۔ ایک ہمسایہ مولوی صاحب کی اپنے بارے میں رائے نظم کرتے ہوئے یہ بتا دیتے ہیں کہ یہ باتیں ان تک کس طرح پہنچیں۔

میں نے بھی سنی اپنے احبا کی زبانی

اقبال کی نظم میں اس واقعہ کے راوی خود اقبال ہیں اس رومانوی سفر میں ان کے ہمراہ ایک فرشتہ بھی ہے۔ یہ کیفیت ان پر بیتی ہے۔ جسے انہوں نے من وعن بیان کر دیا ہے۔

میں نے پوچھی جو کیفیت اس کی　　　حیرت انگیز تھا جواب سردش

آ تو فقیر اور تذکرہ غوثیہ کے واقعات میں آگ لانے کے لئے بچہ اور بالکا دوزخ جاتا ہے۔ لیکن اقبال اس کیفیت کے عینی شاہد ہیں۔ جس سے واقعہ کی صداقت اور حکمت مسلم ہو جاتی ہے۔ روحانی تجربوں اور کرامتوں کے حوالے سے یہ ایک حقیقت ہے کہ اس طرح کے واقعات اکثر اولیائے کرام کے یہاں تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔ ایسی روایات مزید تحقیق کی محتاج ہیں۔ عام خیال یہی ہے کہ تزکیہ نفس کے سفر میں سالک جن منازل سے گزرتا ہے۔ راہ میں ایسے واقعات اسے پیش آتے رہتے ہیں۔ اس لئے ان کے وجود سے انکار مشکل ہے۔ اسی لئے پیر رومی نے فرمایا ہے

زیرکی بفروش و حیرانی بخر　　　زیرکی ظن است و حیرانی نظر

خاکہ

میاں غلام قادر

ذکر پشتو کے ایک سدا بہار شاعر کا

وطن عزیز کے منفرد اور ممتاز مزاح نگار جناب شفیق الرحمٰن کا کہنا تھا کہ (برِاعظم ایشیا میں) ہر انسان کے چہرے پر چالیس برس کے بعد ایسے آثار نمودار ہونا شروع ہوتے ہیں جن سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس شخص نے اپنی زندگی کے یہ چالیس برس کن الّلوں تلّلوں میں گزارے ہیں اور اس دوران اس کے لیل و نہار کیا تھے ۔ البتہ پیر و مرشد کے ایک اور قول کے مطابق یورپ والوں کی بات الگ ہے کیونکہ اول تو ان کا فلسفۂ اخلاقیات ہم سے مختلف ہے۔ دوم وہاں انسان کی عمر جوں جوں بڑھتی جاتی ہے اس کی مالی آسودگی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور اس کی ذمہ داریاں کم ہونی شروع ہوتی ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس کے چہرے والا پر اس آب و ناں کی بیشی کے سبب زرنگ و نم اور لہو کے نمایاں آثار ظاہر ہونا شروع ہوتے ہیں اور بعض اوقات ستر بہتر برس کا پیر مرد یوں لگتا ہے جیسے یہ ... نورانی چہرے والا کوئی پہنچا ہوا بزرگ ہو۔ جناب شفیق الرحمٰن نے چالیس برس کے بعد یورپ والوں کے چہروں کی اس نورانی کیفیت کو ان کی طبعی خوش دلی اور کثرت مے نوشی کی کرامات سے تعبیر کیا ہے:

جہاں تک ہم مشرق کے مسکینوں کا تعلق ہے ہمارے فارسی کے ایک شاعر نے ہمارے لئے ہمارا لائحۂ عمل پہلے سے مرتب کر کے رکھ دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

نشاط عمر باشد تا بہ سی سال　　　چو چہل آمد فرو ریزد پر و بال

پس از پنجاہ نماند تندرستی　　　چو شصت آمد نشست آمد بدیوار

(راقم الحروف کا خیال ہے کہ یہ اشعار پشتو، فارسی کے کسی قدیم شاعر کے ہیں اور آخری شعر کا دوسرا مصرع ضرور یوں ہوگا چو شصت آمد نشست آمد بہ دیوال کیونکہ پشتو میں دیوار کو دیوال کہتے ہیں اور پر و بال کے ساتھ دیوال کا آنا ہی موزوں ہے)

☆☆☆☆

قارئین میں سے اکثر نے صادق الخیری صاحب کی کتاب "مری زندگی فسانہ" پڑھی ہوگی۔ خیری صاحب ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ممتاز ڈرامہ نگار سید امتیاز علی تاج کا جب انتہائی اندوہ ناک حالات میں

انتقال ہوا اور خیری صاحب نے بیگم حجاب امتیاز علی کو ۳۰ سال بعد راولپنڈی میں ایک بیوہ کے روپ میں دیکھا تو دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ وہ ایک بدلی ہوئی خاتون نظر آئیں۔ پریشان، مغموم، ہراساں۔ فرماتے ہیں: میں کیٹس کا شیدائی ہوں، شیلی کا پرستار ہوں۔ بائرن کا مداح ہوں۔ مجھے ان کی تخلیقات کے علاوہ ان کی تصویروں نے بھی متاثر کیا ہے۔ جیسے ان کا کام ذہن کو کشادگی اور روح کو تازگی بخشتا ہے ان کی تصویریں بھی ایک خوبصورت شخص کی نشاندہی کرتی ہیں کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ انسان ہمیشہ جواں رہے۔ حسین رہے شاداب رہے؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ جوانی ڈھلنے کے بعد، حسن ختم ہونے کے بعد، جاذب نظری فنا ہونے کے بعد ایسے لوگ پردے میں بیٹھ جائیں تاکہ ان کے ظاہری نشان نظر نہ آئیں اور کوئی ان کے بڑھاپے کی اداس تصویر نہ پاسکے یہ ٹھیک ہے کہ جب عمر ڈھل جاتی ہے اور سپیدۂ سحر نمودار ہوتا ہے تو قدرت ایک اور حسن عطا کر دیتی ہے جسے وقار کہتے ہیں۔ شوکت کہتے ہیں۔ عظمت کہتے ہیں مگر میرا دل چاہتا ہے کہ تصویر صرف جوانی کی محفوظ ہو اور جب نقش و نگار دل کشی سے محروم ہو جائیں یا حادثاتِ زمانہ کشش و تابناکی چھین لیں تو حسن و جمال کا مخفی رو پوش ہو جائے اور پس پردہ رہ کر اپنے انمول محسوسات کا خزانہ لٹاتا رہے!"

میں نے ابتدا میں یہ طولانی تمہید اس لئے باندھی تاکہ قارئین کو اندازہ ہو کہ عام روش کے برعکس وقت نے اللہ کے فضل و کرم سے جناب شفیق الرحمن اور زیر بحث شاعر محمد یونس خلیل کے سرخ و سپید اور نورانی چہروں پر کوئی ایسے ناخوشگوار نقوش ثبت نہیں کئے جن سے انہیں یہ ضرورت لاحق ہوتی کہ وہ دنیا سے منہ چھپاتے پھریں اور کسی خانقاہ میں ایک طرف بیٹھ کر اللہ اللہ کریں۔

محمد یونس خلیل خوش قسمتی سے سدا بہار اور شگفتہ انسانوں میں سے ایک نایاب فرد ہیں۔ یہ پشاور کے نواحی گاؤں تہکال بالا کے رہنے والے ایک متمول گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔ والد بزرگوار جناب محمد ایوب خان مرحوم صوبائی محکمہ تعمیرات عامہ میں سپرنٹنڈنگ انجینئر تھے۔ بیٹے نے قسام ازل سے طبیعت شاعرانہ پائی۔ سکول اور کالج کے دنوں میں ایسے اعلیٰ پائے کے اشعار کہے کہ سن کر روح وجد میں آتی تھی۔ خود بھی حد درجہ حسین اور اشعار میں بھی یہی حسن و جمال رواں دواں۔ جب بھی رمضان شریف کے علاوہ نفلی روزے رکھتے۔ ہمارے پاس ہاسٹل چلے آتے۔ کہتے: گھر پر والدہ ماجدہ کھلانے پر اصرار کرتی ہیں تو ان سے روزہ چھپانا مشکل ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں عبادت وہ بھلی جو ریا سے پاک ہو۔

اسلامیہ کالج پشاور میں (۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۹ء) ہماری طالب علمی کے زمانے میں نصر اللہ خان

نصر، عبدالرحمٰن کیف اور محمد اشرف مفتون کے ہر طرف چرچے تھے۔ نصر اللہ خان نصر صوبہ سرحد کی ادبی ٹولی کے روح رواں تھے اور کالج کے اولڈ بوائز میں سے۔ ان سے پہلے جن طلباء نے پشتو شاعری میں نام پیدا کیا تھا ان میں جناب سید رسول رسا اور جناب فضل حق شیدا کے نام بڑے احترام سے لئے جاتے تھے۔ محمد یونس خلیل کی شاعری ان سب سے الگ ایک ایسے نوجوان کی مجاز و مطہر شاعری ہے جو جلال و جمال میں کسی تاج محل سے کم نہیں۔

وطن عزیز کے ممتاز ادیب اور نقاد جناب محمد خالد اختر نے ایک مرتبہ (نقوش ۔۔۔ شخصیات نمبر ۔۔۔ جنوری ۵۵ صفحہ ۴۸۵ پر) جناب شفیق الرحمٰن کے افسانوں کے متعلق رائے ظاہر کی تھی کہ "وہ احتیاط برتتا ہے کہ اس کے قلم سے کوئی ایسا خیال نہ ادا ہو جائے جو بستر میں پڑھتی ہوئی سکول کی لڑکی کے چہرے کو شرم سے لال کر دے۔ اسے شریف لوگوں کی طبائع کا بڑا خیال رہتا ہے......"۔ کچھ یہی کیفیت پشتو شاعری میں محمد یونس خلیل کی ہے۔ ان کی شاعری کے جائزے میں خوش گو شاعر، کالم نویس اور نقاد جناب ایوب صابر نے ایک مرتبہ لکھا: "محمد یونس خلیل پہلے وضو کرتے ہیں پھر عشق کرتے ہیں اور عشق کرتے ہوئے ان کی کوشش ہوتی ہے کہ کہیں وضو نہ ٹوٹ جائے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ محمد یونس خلیل، مولانا الطاف حسین حالی کی طرح بھلے مانس غزل گو ہیں اور ٹاپ لیس اور باٹم لیس کے اس جدید ترقی یافتہ دور میں بھی مفلر لپیٹے ہوئے ہیں۔ وہ شعر کہتے ہوئے یوں پھونک پھونک کر قلم چلاتے ہیں جیسے ان سے ذرا سی بھی چوک ہو گئی تو ان کا ایمان اور اسلام خطرے میں پڑ جائے گا۔"

محمد یونس خلیل کے چچا میجر محمد یوسف الکوزئی ایک شیر دل پاکستانی تھے جو ۲۳ اگست ۱۹۴۷ء کو بھٹنڈہ کے قریب و جوار میں اس وقت وطن کی راہ میں شہید ہوئے جب سکھوں نے ان کی ریل گاڑی پر حملہ کر کے نہتے مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی۔ اور انہوں نے جان ہتھیلی پر رکھ کر معصوم بچوں اور عورتوں کو ان کے ظلم و ستم سے بچاتے ہوئے اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کر دی۔

بنا کردند خوش رسمے بہ خاک و خون غلطیدن خدا رحمت کند این عاشقان پاک طینت را

محمد یونس خلیل نے اپنے چچا کی شہادت پر "شہید کی پذیرائی" کے نام سے جو نظم لکھی اس کے چند اشعار کا ترجمہ ملاحظہ ہو: "فردوس بریں میں لب جو حوروں کی محفل سجی ہے۔ پیار کے ترانے گائے جا رہے ہیں۔ ایک کے ہاتھ میں ستار ہے۔ کس سج دھج سے ایک البیلے کا انتظار ہے۔ حوران خلد چشمان مست اور

معراج دار گردنیں لئے یوسف کی ایک جھلک دیکھنے کی منتظر ہیں۔

مدت سے فردوس میں اسی البیلے کے تذکرے ہو رہے تھے۔ جنت کا گوشہ گوشہ اس کی رنگینیٔ خیال سے مست تھا۔

دیکھو! وہ کس شان سے لبوں پر تبسم لئے چلا آ رہا ہے۔ حوریں دیدہ و دل فراش راہ کئے توحید کے اس عظیم فرزند کے استقبال کے لئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''تمہارا یہاں آنا مبارک ہو'' سب نے یک زبان ہو کر کہا پھر وہ اسے ایک آراستہ و پیراستہ محل کی طرف لے گئیں جہاں اس کا جی میٹھے نغموں سے بہلایا جا رہا ہے۔ شہادت کے پاکیزہ لباس میں ہمارا یوسف یوں لگ رہا ہے جیسے گل لالہ میں نکیں گوہر شبنم!''

محمد یونس خلیل ایک خوش نہاد خوش فکر اور خوش گو شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کا عام رنگ رومانوی ہے اور زندگی کے متعلق ان کا نظریہ صحت مند اور مثبت ہے۔ پیشے کے لحاظ سے یونس خلیل سپاہی ہیں۔ میجر محمد یونس خلیل دسمبر ۷۱ء میں مشرقی پاکستان میں جنگی قیدی بنے اور دو سال تک بریلی (بھارت) کے ایک جنگی قیدی کیمپ میں اسیر رہے۔ ان کی نظم ''زنداں کے احاطے میں'' کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

''زنداں کے احاطے میں تیری یاد کی چاندنی کھل اُٹھی
میری آزادی کو پہرہ داروں نے سنگینوں کی نوک میں پرو دیا ہے
خاردار تاروں کے سائے میں ہر قدم پر ایک صلیب ایستادہ ہے
ایسے میں تیری یاد کی خوشبو سنگینوں کے زخم کھاتی خاردار تاروں سے گزر آئی
اپنی پلکوں پر روشن چراغ سجائے اس نے میری ہستی پر سہانی روشنی کا سائبان
بنا دیا جس کے سائے میں کئی بے نام بہاروں کے پھول مہک اٹھے۔''

محمد یونس خلیل کی دو قومی نظمیں جو انہوں نے سقوط ڈھاکہ کے بعد ایام اسیری کے دوران لکھیں ''عظمتوں کی معراج'' اور ''زنجیروں کی جھنکار'' شاعر کے بدلے ہوئے انداز فکر کو خوب واضح کرتی ہیں۔ ہم قارئین کرام کی خدمت میں ''زنجیروں کی جھنکار'' بصورت ترجمہ پیش کرتے ہیں:

''تاریخ کے اس حادثے میں
تاریکی کے اس لمحے میں

افکار کے قافلے رواں دواں ہیں

درد کا بیاباں پھیلا ہوا ہے

فضا میں ان شمعوں کا دھواں پھیل رہا ہے

جن کو ستم کی ہوا نے وفا کے شبستان میں گل کر دیا تھا

حُسن و وفا کی روشن راہوں میں ذہن کی یہ منزلیں

میری وفا کی یہ نشانیاں

میری سربلندی کے یہ عظیم خواب

یہ عنایتیں اور سوغاتیں

یہ دعائیں اور رحمتیں

صدیوں کے سائے تلے میری اٹھائی ہوئی یہ عظمتیں

اب یوں دکھائی دے رہی ہیں جیسے گردِ راہ ہوں!

یہ سچے موتیوں کی چمک اور آب و تاب تھی

یا میری نگہ کی تشنگی سراب پر جم گئی تھی

میرے پاؤں میں زنجیریں اور جھولی میں محض خواب ہیں

یہ زنجیریں زنداں کی تاریکی میں کھنکھنا رہی ہیں

خاردار تاروں کے سائے میں ایک ویران سا رستہ

میرے زخموں کو گن رہا ہے

میرے شب و روز کا مطالعہ کر رہا ہے

لیکن زنداں کی تاریکی میں احساس کی مشعل روشن ہے

میرا وجود ایک مجسم آنکھ ہے اور میری اپنی تاریخ میرا تماشا ہے

میرے گزرے ہوئے اوقات پھولوں کی طرح ہیں جن کو ہزار زبانیں گویائی کے لئے مل گئی ہیں

تاریکی کی ویراں گزرگاہوں پر صبا قدم آگے بڑھانے لگی ہے

میری روح کے اندر غم کے سائے ہما کا سایہ بن گئے ہیں

میرے زخموں کی یہ محفل چراغاں اس رات کی مانند ہے

جو آزادی کی تقریب بھی ہے اور انسان کے لئے راہ نجات بھی

جو میرے وطن کا ناموس بھی ہے اور میرے وطن --- پاکستان -- کا نام بھی

میں اپنے پاؤں کی زنجیروں سے اٹھی ہوئی وہ آواز بن جاؤں گا

جو نغمۂ سربلندی اور ایک نئی بہار کی بشارت ہوتی ہے

جو زلفوں میں مہکتا ہوا گلاب اور مانگ میں سیندور بن جاتی ہے

جو دلوں میں قرار اور ہونٹوں پر مسکراہٹ بن کر ابھرتی ہے

میری تاریخ صدیوں سے عظمت کا جو خواب دیکھ رہی ہے

وہ زندگی کی صبح نو بن جائے گی

اس کو تعبیر مل جائے گی

جب میں اپنے پاؤں کی زنجیروں سے اٹھی ہوئی آواز بن جاؤں گا

☆☆☆☆

اب محمد یونس خلیل کی پشتو غزلوں کے چند اشعار کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

☆ خلوص کی سودا بازی عجب اوزان سے ہونے لگی

کسی نے میزان میں سونے کی ڈلی ڈالی کسی نے دل کی دھڑکنیں!

☆ تیری مسکراہٹ اور بہار -- ایک ہی چیز کے دو نام ہیں فرق صرف اس قدر ہے کہ یہاں بہار سمٹ کر رہ گئی ہے اور وہاں پریشان ہے؟

☆ بہار، چاند اور نغمے ----- ان سب کا تذکرہ گویا تیرے ذکرِ جمیل کے بہانے ہیں!

☆ انسان کی فہم و بصیرت پر افسوس کہ اس نے محض تخریب کاری پر تعمیر تو کرنی چاہی اور اس جہان رنگ و بو کو دوسرے انسانوں کے لئے جہنم زار بنا دیا!

☆☆☆☆

آفاق صدیقی

سکھر کا ایک یادگار مشاعرہ

برسوں پہلے کا ذکر ہے سکھر میں بڑی آن بان سے "جشنِ مہران" منایا جاتا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب پاکستان کے دونوں بازو سلامت تھے۔ 'جشنِ مہران' کے دنوں میں ادبی تقاریب کا اہتمام بھی ہوتا جن میں انڈو پاک مشاعروں کے انعقاد کو نمایاں حیثیت حاصل رہی۔ ان کا اہتمام ادبی کمیٹی کرتی تھی جس کا صدر نشیں حاکم ضلع یعنی ڈپٹی کمشنر ہوتا تھا۔

بھائی منصور عاقل اس دور میں مغربی پاکستان کی حکومت کے محکمۂ اطلاعات و مطبوعات کے ڈائریکٹر تھے۔ خیر پور کمشنری کا صدر مقام خیر پور تھا مگر ادبی و ثقافتی چہل پہل سکھر میں زیادہ رہتی تھی اس لئے اکثر و بیشتر ہماری تقاریب میں شریک ہوتے۔ جشنِ مہران کا سالانہ یادگار مشاعرہ جس میں بہت سے نامی گرامی شعراء سکھر آئے۔ صدر مشاعرہ فیض احمد فیض اور مہمانِ خصوصی جوش ملیح آبادی۔ حاضرین کی تعداد اتنی بڑی کہ مہران کلچرل سینٹر کی سماعت گاہ میں نہ سما سکے اور پاس پڑوس کی چھتوں پر براجمان ہو گئے۔

مشاعرے کی نظامت جناب منصور عاقل کے ذمے تھی آپ نے بہت شستہ و شائستہ فقروں اور برجستہ اشعار سے وہ سماں باندھا کہ شعراء کے کلام کا لطف دوبالا ہو گیا اور حاضرین بھی بہت محظوظ ہوتے رہے۔ کیا مجال جو کسی گوشے سے کوئی ناشائستہ آواز آئی ہو۔ آدھی رات بیت گئی اور دور دراز کے ممتاز مہمان شعراء کی باری آئی تو منصور عاقل صاحب کے حافظے نے جولانیٔ طبع سے ہر شاعر کا تعارف ایسے دلکش اشعار میں کرایا کہ ڈائس پر موجود شعراء اور باذوق حاضرین نے بیساختہ داد دی۔

جب مشاعرے کے آخری دو شاعر یعنی جوش اور فیض باقی رہ گئے تو مائک پر آواز گونجی خواتین و حضرات! اب حضرت جوش ملیح آبادی اور محترم فیض احمد فیض کو دعوتِ کلام دینے سے پہلے یہ سوچ رہا ہوں کہ:

شکارِ ماہ کہ تسخیرِ آفتاب کروں   میں کس کو ترک کروں کس کا انتخاب کروں

دنیائے ادب کی دو عظیم شخصیات ہمارے درمیان ہیں اور میں خود کو اس کا متحمل نہیں پاتا کہ تقدیم و تاخیر کا فیصلہ کر سکوں' چنانچہ یہ کہہ کر جناب عاقل نے مائک فیض و جوش کے درمیان رکھ دیا۔

یہ سنتے ہی فیض صاحب جو صدر مشاعرہ تھے مسکراتے ہوئے حاضرین کے روبرو آئے اور اپنے

مخصوص دھیمے لہجے میں دو غزلیں اور دو نظمیں سنا کر رخصت ہو گئے پھر جیسے ہی جوش صاحب نے مائک سنبھالا۔ ہر طرف شور اٹھا: "کیا گلبدنی گل بدنی ہے"

جوش صاحب یہ نظم جشن مہران کے مشاعروں میں پہلے بھی سنا چکے تھے اس لئے کچھ اور سنانا چاہتے تھے۔

بھائی منصور عاقل نے اس وقت کیا کہا اور حاضرین نے کیا سنا یہ تو مجھے یاد نہیں البتہ میری آنکھوں نے دیکھا اور محسوس کیا کہ کتنی شیریں بیانی سے موصوف نے "گلبدنی" کا مطالبہ کرنے والوں کو اس بات پر راضی کیا کہ شاعر شباب وانقلاب پہلے اپنی پسند سے رباعیات وغیرہ سنائیں گے' اکتارہ' بھی بولے اور مشاعرے کا اختتام "گل بدنی" پر ہوگا۔

غالباً پچاس برس پہلے سرکاری ادبی ماہنامہ' ماہ نو' میں جبکہ کراچی پاکستان کا دارالسلطنت یا دارالحکومت تھا 'پروفیسر وقار عظیم اس جریدے کے مدیر تھے' ڈاکٹر تاثیر کی ایک خوبصورت نظم فکر انگیز و بصیرت افروز "ید بیضا" شائع ہوئی تھی۔ اس نظم کی ہیئت تو آزاد نظم کی تھی مگر درمیان میں ایسے اشعار بھی تھے جو منفرد حیثیت سے بھی پڑھے جائیں تو اچھے لگیں۔ نظم کا ابتدائی حصہ جو میرے حافظے میں ہے وہ کچھ یوں تھا ۔

مجھے تلاش رہی ہے
نہیں تلاش نہیں
تلاش میں تو طلب جستجو سی ہوتی ہے
دبی دبی سی کسی آرزو سی ہوتی ہے

اس نظم کے نقطۂ عروج کا ایک شعر ملاحظہ ہو ۔

شکار ماہ کہ تسخیر آفتاب کروں
میں کس کو ترک کروں کس کا انتخاب کروں

منصور عاقل صاحب نے ڈاکٹر تاثیر کی یہ نظم جو بعد کو ان کے مجموعہ کلام میں بھی شامل ہوئی بغور پڑھی ہو گی تبھی تو جوش اور فیض کی باری پر اس کے ایک خوبصورت شعر نے کام کر دکھایا۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے قیام پاکستان کی دسویں سالگرہ کے بعد جو شاعری کا تنقیدی جائزہ کسی ادبی جریدے میں پیش کیا تھا اس میں ڈاکٹر تاثیر کی نظم ید بیضا کو سب سے اچھی نظم قرار دیا تھا۔

ایسا بھی ہوتا ہے

صبح کا سہانا وقت تھا۔ چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اتنے میں اذان کی آواز آنے لگی۔ میں نے اٹھ کر فجر کی نماز ادا کی۔ ابھی میں دعا مانگ ہی رہی تھی کہ حسب معمول پڑوس سے مالن کے رونے پیٹنے کی آواز آنے لگی۔ مالی اسے بری طرح سے مار رہا تھا اور وہ چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔ میں ایک کمزور دل عورت! مجھ سے برداشت نہ ہوا۔ میں اپنا گیٹ کھول کر اسے بچانے پہنچ گئی۔ مالی ہمارے بنگلہ پر بھی کام کرتا تھا اور مجھے بڑی عزت واحترام کی نظر سے دیکھتا تھا۔ میں نے جاتے ہی کہا "مالی! یہ کیا ہو رہا ہے؟ تمہیں عورت کو مارتے شرم نہیں آتی"۔

اس نے مالن کے بال ایک دم چھوڑ دیئے اور بیوی کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سرونٹ کوارٹر میں لے گیا۔ یہ بنگلہ ہمارے پڑوسی اسد اللہ خان کا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کی بیوی اپنے بیٹے کے پاس لندن چلی گئی تھیں اور اپنے بنگلہ کی چوکیداری کے لئے مالی کو چھوڑ گئی تھیں۔ چنانچہ مالی اپنی دونوں بیویوں سمیت اس بنگلہ میں رہ رہا تھا۔ جب مالی اپنی بیوی کو اپنے سرونٹ کوارٹر میں لے گیا تو میں نے دیکھا وہیں چارپائی پر اس کی سوکن بیٹھی ہے۔ مجھے اسے دیکھ کر بہت غصہ آیا کہ یہ کیسی عورت ہے کہ ایک عورت کو پٹتا دیکھ رہی ہے اور اسے اس پر قطعی ترس نہیں آیا کہ اٹھ کر اسے بچا لیتی۔ چنانچہ میں نے اس سے پوچھا کہ ایک بات بتاؤ کہ تم کیسی عورت ہو کہ ایک عورت کو پٹتا دیکھ رہی تھیں مگر اسے پٹنے سے بچا نہیں رہی تھیں۔ وہ بھی تو تمہاری طرح کی ایک عورت ہے۔ مجھے دیکھو میں بھی ایک عورت ہوں' جو اسے بچانے کے لئے اپنے گھر سے نکل کر آ گئی۔

بیگم صاحب! میں عورت ضرور ہوں مگر اس کی سوکن ہوں۔ سوکن اور عورت میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔ سوکن تو چوکر کی بھی برداشت نہیں ہوتی۔ اس ڈائن نے میرا گھر برباد کیا' میرے سہاگ پر ڈاکہ ڈالا۔ میرے میاں نے اس کے عشق میں مبتلا ہو کر مجھ پر ایسے ایسے ظلم ڈھائے کہ زمین و آسمان تھرا جائیں۔ اس ذلیل عورت نے مجھے ایسے ایسے دکھ دیئے ہیں جس کے زخم آج بھی میرے سینے میں رِس رہے ہیں۔ اس نے تو کبھی مجھ پر رحم نہیں کھایا۔ اب میں کیوں اس پر ترس کھاؤں۔ اس کی باتیں سن کر اب مجھے اس کی سوکن پر ترس

آنے لگا۔ میں اور باتیں کرتی مگر میرے شوہر کے آفس جانے کا وقت ہو رہا تھا اور انہیں ناشتہ کرانا تھا۔ اس وجہ سے گھر آ گئی۔

مالن چونکہ صبح کام پر نہیں آئی تھی۔ اس وجہ سے جب وہ شام کو کام کرنے آئی تو میں نے اسے کوئی کام نہیں کرنے دیا اور اپنے پاس بلا کر اس سے ایک دم سوال کیا "مالن! ایک بات بتاؤ میں تو تمہیں بہت معصوم سمجھتی تھی کہ مالی تو تمہیں بے وجہ اکثر و بیشتر مارتا رہتا ہے۔ مگر تمہاری سوکن سے پتہ چلا کہ سارا قصور تمہارا ہے۔ ظالم تو تم ہو کہ آنکھوں سے اس کی بیوی بچوں کو دیکھتے ہوئے مالی سے نکاح کر بیٹھیں۔ کیا مالی کے علاوہ تمہیں اور کوئی مرد نہیں ملا؟"

ہاں بیگم صاحبہ! میں نے یہ غلطی' یہ گناہ دیدہ و دانستہ کیا مگر سچ پوچھو تو اس میں میری اتنی غلطی نہیں ہے جتنی ہمارے گاؤں کی رسم "وٹہ سٹہ" کی بے جوڑ شادی کی ہے۔ جس میں گاؤں والے صرف ادلہ بدلہ کرنے کی غرض سے کچھ بھی نہیں دیکھتے اور اپنی کمسن لڑکیوں کو اپنی مصلحت کی بنا پر جہنم میں جھونک دیتے ہیں۔ میری ماں بچپن میں مر گئی تھی اور میرے باپ کو کسی نے رشتہ نہیں دیا۔ میرے سابق شوہر کی ایک بیوہ بہن اچھی عمر کی بیٹھی تھی۔ اس کو اس کی شادی کی بڑی فکر تھی۔ گاؤں کی ایک عورت نے میرے سابق شوہر سے اس کی بہن کا رشتہ میرے ابا کیلئے مانگا تو اس نے ابا سے میرا رشتہ مانگ لیا۔ میری عمر اس وقت صرف چودہ سال کی تھی۔ اس کی عمر پچاس سال تھی اور چار بڑے بڑے بچوں کا باپ تھا۔ میرے ابا کو اپنی شادی کے شوق نے ایسا دیوانہ کیا کہ انہوں نے اپنی چودہ سالہ بیٹی کو بے سوچے سمجھے بڈھے سے بیاہ دیا۔ میرا کبھی بھی اس شخص سے دل نہ ملا۔ میں روتی رہی' پیار کو ترستی رہی۔ نکاح کے دو بول نے تین بچوں کی ماں بھی بنا دیا۔ جب میری مالی سے پہلی ملاقات ہوئی میرا بڑا بیٹا تیرہ سال کا تھا۔ مالی ہمارے ہی محلہ میں رہتا تھا۔ چنانچہ گھر سے آتے جاتے اکثر آمنا سامنا ہوتا تھا۔ گاؤں کی کوئی شادی ہو یا کوئی تقریب ہر جگہ میری اس سے ملاقات ہونے لگی۔ مالی خوبصورت بندہ تھا۔ پہلی ہی ملاقات سے وہ مجھے اچھا لگنے لگا وہ بھی مجھ سے ملنے کے بہانے ڈھونڈنے لگا۔ چھوٹے دیور سے دوستی کر لی اور گھر بھی آنے جانے لگا۔ میری بوڑھی ساس سیدھی سادھی خاتون تھیں آنکھ سے بھی کم نظر آتا تھا۔ جب وہ آ کر میرے دیور کے پاس بیٹھک میں بیٹھتا تو میری ساس بڑے پیار سے آواز دیتیں "پتر باہر غیروں کی طرح کیوں بیٹھا ہے جیسا اجمل ویسا تو ہے گھر میں آ جایا کر تجھ سے بھلا کون پردہ کر رہا ہے"۔

میرا خوشی کے مارے برا حال ہو جاتا۔ میں جلدی جلدی چائے بناتی اور اجمل اور مالی کو دے آتی۔

اس کے علاوہ محلے میں مالی کے ایک عزیز کا گھر تھا۔ ان کی بیٹی میری سہیلی تھی میں سہیلی سے ملنے کے بہانے تقریباً روزانہ ان کے گھر جانے لگی اور وہاں مالی سے ملاقات کا سلسلہ جاری رہا۔ مجھے بچپن سے پڑھنے کا بڑا شوق تھا۔ جب میری شادی ہوئی میں نے پانچویں جماعت پاس کرلی تھی۔ چنانچہ تھوڑا بہت لکھنا پڑھنا آ گیا تھا۔ اس لئے میری مالی سے خط و کتابت بھی ہونے لگی۔ مالی سے دوستی کو تقریباً دو سال ہو گئے تھے۔ میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ میرے پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے۔ میں مہندی چوڑی سے لیکر ساتوں سنگھار کرنے لگی۔ مجھ پر ٹوٹ کر روپ آیا۔ محلے والے کہتے "اری مسعودی تو شادی کے وقت بھی خوبصورت تو تھی مگر شادی کے بعد نہ تجھ پر جوانی چڑھی اور نہ حسن پر نکھار آیا۔ اللہ نظر بد سے بچائے اب تو تُو بہت ہی خوبصورت ہو گئی ہے"۔ میں ان کی باتیں سن کر ٹال دیتی۔ جیسے میں اپنا کوئی جرم چھپا رہی ہوں۔ رہے بڑے میاں تو جب میں شادی ہو کر آئی نا تو تب انہیں نظر آئی اور نہ آج کی کوئی تبدیلی نظر آتی تھی۔ بس میں انہیں حقہ بھر کر کوٹھری میں دے آتی۔ وہ حقہ پیتے رہتے اور کھانستے رہتے۔

میں مالی کے عشق میں پاگل ہو رہی تھی۔ ایک دن اس کو نہ دیکھتی تو حلق سے نوالہ نہ اترتا۔ اس وقت نہ مجھے دنیا کی پرواہ تھی نہ سماج کی اور نہ ہی مالی کے بیوی بچے مجھے نظر آتے تھے۔ اسی طرح ہماری محبت کے چکر کو دو سال گزر گئے۔ آخر کار ایک دن مالی نے مجھے خط لکھ ہی دیا "مسعودی اب میرے لئے برداشت کرنا ناممکن ہو گیا ہے۔ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم گھر سے بھاگ کر کورٹ میرج کرلیں اور شہر میں گھر لیکر وہیں رہنے لگیں۔ مجھے فوراً تمہاری رضا چاہیے تاکہ میں بقیہ پروگرام طے کرسکوں"۔

بیگم صاحب! میں نے بڑی خوشی سے اسے اپنی رضا دے دی۔ اس وقت نہ مجھے اپنی بوڑھی ساس کا خیال آیا۔ جن پر اپنے بچے چھوڑ رہی تھی جبکہ سب سے چھوٹی بچی تو سال کی تھی۔ رہا بڑے میاں کا خیال تو انہیں تو کبھی میں نے شوہر سمجھا ہی نہیں تھا۔ ان سے صرف دو بول کا رشتہ تھا جو جبریہ نبھا رہی تھی۔ مجھے اس بڈھے شوہر کی عزت کی بھی پرواہ نہ ہوئی کہ میرے گھر سے بھاگنے پر محلے والے صبح کیسی کیسی باتیں نہ بنائیں گے اور یہی ہوا بھی کہ میرے بھاگنے پر وہ یہ بے عزتی نہ برداشت کرسکا اور اگلے ہی دن اس کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ غرضیکہ ہم نے پروگرام کے مطابق ایک رات گھر سے بھاگ کر شہر جا کر کورٹ میرج کرلی اور اپنا گھر بسا لیا۔ تقریباً آٹھ سال ہم نے بہت ہنسی خوشی گزارے زندگی میں پہلی بار خوشی ملی تھی۔ خوشیاں سمیٹتے سمیٹتے دامن چھوٹا پڑ جاتا تھا۔ ہمارے چمن میں دو پھول بھی کھل گئے۔ مگر پھر اچانک ہماری زندگی میں ایک طوفان آ ہی گیا جس کا مجھے ہمیشہ

خطرہ رہتا تھا۔ شاید میری سوکن کی بددعائیں خدا نے سن لی تھیں۔

چند دنوں سے میں محسوس کر رہی تھی کہ مالی کچھ چپ چاپ رہتا ہے اور کسی سوچ میں کھویا کھویا سا رہتا ہے۔ میں نے اس سے کئی بار اس کی وجہ پوچھی مگر وہ ٹال جاتا تھا ایک دن پھر میں نے بہت پوچھا تو وہ بولا "مسعودی! سچی بات یہ ہے کہ مجھے اپنے بیوی بچے بہت یاد آ رہے ہیں' میں انہیں بے قصور چھوڑ کر اس طرح آ گیا ہوں"۔

مجھ پر تو جیسے بجلی گر گئی میں بغیر جواب دیے وہاں سے اٹھ کر آ گئی"۔

چند ماہ مالی کی یہی حالت رہی۔ آخر کار اچانک وہ یہ کہہ کر گاؤں چلا گیا کہ وہ میرے بیوی بچے ہیں میں ان سے مل کر تمہارے پاس لوٹ آؤں گا۔

مالی ایک ماہ اپنے بیوی بچوں کے پاس رہ کر لوٹ آیا۔ اس نے بتایا کہ اس نے اپنی بیوی سے دوسری شادی کرنے کی معافی مانگی اور آخر کار اس کو منالیا۔ اس کے آنے جانے کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ مگر اب ہمارے لڑائی جھگڑے شروع ہو چکے تھے۔ مالی نے شہر میں بڑا گھر لیکر ہم دونوں کو اکٹھا رہنے پر مجبور کیا کیونکہ وہ دو گھروں کا الگ الگ خرچہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ مگر اکٹھا رہنے سے ہمارے لڑائی جھگڑے بہت بڑھنے لگے۔ حتیٰ کہ اب وہ مجھ پر ہاتھ بھی اٹھانے لگا۔ خرچہ کی بھی تنگی ہونے لگی۔ اس کے کہنے پر میں گھر گھر جا کر ملازمت بھی کرنے لگی۔ اب وہ مجھے کچھ دینے کے بجائے میری تنخواہ کے روپے بھی مجھ سے لے لیتا ہے۔ میں اس سے مار بھی کھاتی ہوں' تنخواہ بھی اسے دے دیتی ہوں مگر پھر بھی اس کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔

بیگم صاحبہ! یہ وہ دور ہے جس سے میں اب گزر رہی ہوں۔ بقیہ زندگی تو اب ایسے ہی کٹے گی۔ مجھے اس بات کا یقین نہیں کہ وہ اب بھی مجھ سے محبت کرتا ہے! کیونکہ سنا تو یہی ہے کہ مرد کا کوئی اعتبار نہیں۔ وہ بڑا بے وفا ہوتا ہے۔ مگر میں مالی کے بارے میں اتنا ضرور جانتی ہوں کہ جب وہ مجھے مارتا ہے تو پھر مجھ سے رو رو کر معافی بھی مانگتا ہے' پیار بھی کرتا ہے' گرم گرم دودھ میں پھٹکری ڈال کر بھی پلاتا ہے تاکہ میری چوٹ ٹھیک ہو جائے۔ اس کے باوجود مجھے اس کی قطعی پروا نہیں کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے یا نہیں! مگر میں ضرور اس سے محبت کرتی ہوں۔ کیونکہ جب وہ لڑتا ہے تو میں دل میلا نہیں کرتی' اس کی مار میں بھی مجھے سکون اور ٹھنڈک ملتی ہے۔ کیونکہ وہ میرے سر کا سائیں ہے۔ میرا سہاگ ہے۔ میری خدا سے دعا ہے کہ میرا جنازہ مالی کے کندھے پر جائے۔ آمین!

بیگم صاحبہ! میں آپ کو سمجھا نہیں پا رہی کہ میں اس سے کیسی محبت کرتی ہوں۔ میں نے اس کی بات درمیان میں ہی کاٹ دی اور بولی اچھا بس! تم مجھے مت سمجھاؤ میں سمجھ گئی کہ تم کیا کہنا چاہ رہی ہو۔

محمد اویس جعفری

(سیاٹل ۔ امریکہ)

حمد

تو ہی خالق تو ہی خلاق عالم
تو ہی رازق تو ہی رزاق اعظم

قدیر و قادر و مختار و اعلیٰ
تو ہی ہے سب سے برتر سب سے بالا

تو ہی ظاہر تو ہی مستور بھی ہے
رگِ جاں سے قریں ہے دور بھی ہے

تو ہی شاہد تو ہی مشہود بھی ہے
حمید و ہادی و محمود بھی ہے

تو ہی مطلوب تو مقصود میرا
مرے معبود تو مسجود میرا

عطا، جود و سخا الطاف تیرے
ہیں عفو و درگذر اوصاف تیرے

تخیل کو پر پرواز دیدے
سخن کو پرتوِ اعجاز دیدے

زباں وہ دے کہ تیرے گیت گاؤں
ترے اسمائے حسنیٰ گنگناؤں

شریکِ حلقۂ اہلِ وفا کر
مجھے راتوں کی بیداری عطا کر

جبیں کو سجدہ ہائے شوق دیدے
مجھے بھی بندگی کا طوق دیدے

تجلی سے اسے معمور کر دے
مرا سینہ الٰہی طور کر دے

مرے نالوں کو دے ایسی رسائی
کہ تھامے ہاتھ تیری کبریائی

حرم کی دید مجھ پہ عام کر دے
نظر کو حاملِ احرام کر دے

سکھا دے وہ محبت کا قرینہ
کبھی کعبہ کبھی دل ہو مدینہ

مری ٹھوکر پہ ہو شاہوں کی شاہی
نبیؐ کے در کی مل جائے گدائی

دعائیں سننے والے حق تعالیٰ
مرے ماں باپ کا رتبہ ہو بالا

وہ تیرے تھے کیا تیرے حوالے
مرے مولا انہیں اپنا بنالے

اویسؔ تشنہ لب پھیلائے داماں
برس جا بن کے اک ابرِ بہاراں

عبدالعزیز خالد

مدینۃ النبیؐ

اے دیارِ دلکشا! اے طیبہ کی سرزمیں — سر جھکاتے ہیں جہاں تعظیماً افلاک بریں
عالمِ اسلام پر ہیں کس قدر احساں ترے — کم ہے اپنے بخت پر تو ناز جتنا بھی کرے
اے مقدس قبر و منبر مبارک کی زمیں — تجھ میں محوِ استراحت ہیں شہِ دنیا و دیں
تیرے کتنے نام لکھی ہے محبت کی زباں — جن میں ہر یک لفظ و معنیٰ ہے اک تازہ جہاں
قلب الایمان، قبۃ الاسلام، حسن و قُصبہ — مسلمہ، محفوفہ، محبوبہ، محبہ، مومنہ
مُجبّرہ، مرزوقہ، مسکینہ، معزّہ، موفیہ — مؤنسہ، مجبورہ و محفوظہ، غرّاء، فالیہ
سیّد البلدان، ذات النخل، خیرہ، خیّرہ — جابرہ، جبّارہ، مجبورہ، عروض و غالیہ
بارّہ، برّہ، حبیبہ، مردمِ چشمِ حجاز — سنگ ہائے نجد میں سرچشمۂ سوز و گداز
آبِ شیریں تیرا زمزم کی طرح آبِ حیات — اے حسیں شہرِ درود و حمد و تسبیح و صلوٰۃ!
خاکِ مشکیں ہے تری خاکِ شفا اے شافیہ! — کیوں نہ ہو آخر سکینہ کی ہے تو ہم قافیہ
شاکرہ، مشکورہ، مستورہ، کفیلہ، کافیہ — شاہدہ، مشہودہ، مشکوٰۃ و عفیفہ، عافیہ
دارِ فتح و دارِ ہجرت، طیبہ، طابہ، طیّبہ — مُفضلہ، مقبولہ، مرفوعہ، رفیعہ، دافعہ
مدخل الصدق و مُجیرہ، بحرہ، ارض اللہ، طاب — مسکنِ انسانِ ناب و مضجعِ ختمی مآب
عاصمہ، معصومہ، مرحومہ، حرم، ذات الحجار — اے خنک دار القرارِ قلب ہائے بے قرار!
ہے تجھی دار السلامہ، ہے تجھی دار السلام — ہے تجھی دار الکرامہ، ہے تجھی دار الکرام
عامرہ، معمورہ، ناموسہ، امینہ، آمنہ — صادقہ، صدیقہ، مصدوقہ، سلیمہ، سالمہ
قاصمہ، مختارہ، عذرا، محرّم و نبلہ، ناجیہ — ناصرہ، منصورہ، مرقیہ، رفیّہ، راقیہ
قبۃ الایمان و یثرب، اثرب، بیت الرسول — جس پہ ہوتا ہے ہر اک "صبح" کا اب بھی نزول
دار الانصار و مدینہ، دار الابرار و بلاط — بیت الاخیار و مکینہ، کارواں گاہ و رباط
صادقہ، سلویٰ، عرا، محروسہ و ذات الحجر — جس کے سنگ و خشت رشکِ لالہ و لعل و گہر
خیرہ، حسناء، دار السنہ، مکنون و کتاں — ہے مزارِ سبز گوں جس کا حرزِ انس و جاں

آنکھ بھر کر دیکھنے سے جس کو، خیرہ ہو نگاہ
جس کا روحانی تصرف بے کران و بے پناہ

گو نہیں ام القریٰ، تاہم کعبۂ البلدان ہے
تجھ سے، خضرا! تری پہچان، تیرا مان ہے

تجھ سے درجے میں فزوں تر ہے اگر تو البلد
اتّباع کی جس کی کمائی ہے قسم ذاتِ احد

شہر بیت اللہ ہے مکہ اور تو شہرِ نبیؐ
سارے شہروں پر ہے تجھ ہی کو حاصل برتری

تنگنائے پر تری قرباں فراخائے جہاں
ہر پریشاں حال کو دامن ترا گنجِ اماں

اے اقامت گاہِ اصحاب و نفوسِ قدسیہ
تجھ میں آتے ہی سکوں کیسا یہ دل کو مل گیا

جا نہیں واماندگی بس آسائشِ منزل رہی
زادِ راہِ مستمنداں عاجزی در عاجزی

رات دن گرمِ سفر ہے گردِ راہِ کارواں
آستاں پر تیرے سارا سال جھکتا ہے جہاں

چشم دید احوال کے کہنے سے قاصر ہے زباں
سچ کہا جس نے کہا لیس البیان کالعیاں!

جانِ جاناں، جانِ جاں، جانِ جہاں، جانِ حزیں
اے ادب گاہِ محبت! اے دبستانِ تمیز!

سیر از جلوہ نمی گردد نگاہِ پُر عطش
تشنہ جاں صحراست ایں مسجد السعود کش

آنسوؤں سے پلکیں اہلِ درد کی بھیگی ہوئی
ہے یہی تمنا کی ان کی زینت و زیبندگی

دیدِ دوست ان کو نوید فرحت و فرخندگی
اضطرابِ نارسائی ہے کمالِ بندگی

ہے تحیر در تحیر عاقلانِ ذوفنوں
دیکھ کر سرمستی و سرشاری اہلِ جنوں

ہو مواجہ سے گزر ہر فرد کا بارِس ورنہ
بے محل اس احساسِ غم سے ہے متاع اس کی کم ارز

روزنِ در سے، ہو طالع گر کسی کا اوج پر
اک جھلک سی گاہ آ جائے اسے اس کی نظر

نور جس کا اقتباسِ نورِ ربِّ ذوالجلال
بے حلول و اتحاد و اتصال و انفصال

جس کے سینے میں وہ دل ہے جو کبھی سویا نہیں
وقت کے جس نے کسی لمحے کو بھی کھویا نہیں

شب گزیدوں کو نویدِ صبحِ روشن جس نے دی
رکھ دی کایا ہی پلٹ کر کارخ ہست و بود کی

مضطرب جس کو کرے فریادِ دلہائے حزیں
ہے ابد آباد تک جو رحمۃ للعالمیںؐ!

اپنی آنکھوں سے جو کرتا ہے نگہداری پہ
بہر اقوام و امم، فرمانروائے بحر و بر!

عالمِ امکاں میں کوئی دوسرا جس سا نہیں
ہے جو برحق خاتم الارسال و ختم المرسلیں

کیا کہوں بیتی دمِ رخصت دلِ خالد پہ کیا!
مرغِ جاں بس پسلیوں میں پھڑپھڑا کر رہ گیا

آہ وہ بیکل فضائے شامگاہِ وداعیں!

وہ سلامِ حسرت آیاتِ نگاہِ وداعیں!

سہیل اختر

نعت

دعا میں آہی جائے گا اثر آہستہ آہستہ
شجر کو جیسے لگتا ہے ثمر آہستہ آہستہ

ابھی تو آبلہ پائی مقدر اپنا ٹھہرا ہے
کسی منزل پہ پہنچے گی نظر آہستہ آہستہ

ہوئے تعریف میں رطب اللساں شاہِ دو عالمؐ کی
حجر آہستہ آہستہ بشر آہستہ آہستہ

وہ اِک تنہا مسافر دین کی لمبی مسافت کا
بنا سارے جہاں کا راہبر آہستہ آہستہ

ازل کی لوح کے اسرار مخفی صورت قرآں
اتر آئے سب اس کے قلب پر آہستہ آہستہ

سمجھ جائیں گے یہ عقل و خرد والے بھی بالآخر
رموز معجزۂ شق القمر آہستہ آہستہ

دیارِ شوق سے دوری کی دھول اڑتی رہی یوں ہی
تو بن جائے گا یہ دل بھی کھنڈر آہستہ آہستہ

سہیل اِک دن مدینے سے بلاوا آئیگا پھر بھی
عقیدت رنگ لائے گی مگر آہستہ آہستہ

سید رفیق عزیزی

نعت

ازل سے ہوں میں غلام محمد عربی ﷺ
مری حیات مدینے کی خاک میں ہے دبی

حضورؐ آپ ہیں میری دعائے نیم شبی
لوائے حمد کے سائے میں ہو مری کلبی

حضورؐ آپ ہیں میرے مسبب الاسباب
میں جانتا ہی نہیں چیز کیا ہے بے سببی

تعین آپ کے رتبے کا ، کارِ بوالعجبی
ہیں منکرین بشیر و نذیر بولہبی

ہو جس کی حمد ، محمدؐ اسی کو کہتے ہیں
خیال میں ہو دوئی تو کمال بے ادبی

وہ لفظ ہی کہاں جس سے ہو ذکر آقاؐ کا
حضورؐ کے لیے زیبا ہر ایک خوش لقبی

وہ نور نور ہی کیا، مظہر اتم بھی ہیں
مرے حضورؐ کا پر تو ہیں سب ولی و نبی

آپ کے در کا ہے ایک ذرۂ خاک
بھی شناخت ہے یا ہاشمی و مطلبی

محمد حسن زیدی

نعت

پھر مدینے کا سفر یاد آیا
نورِ تا حدِ نظر یاد آیا

کتنی صدیوں سے شناسائی ہے
ان کی الفت کا اثر یاد آیا

بھول کر ان کے حرم میں بھی کبھی
اپنی اولاد نہ گھر یاد آیا

گنبدِ سبز کا رنگیں منظر
ہر گھڑی مجھ کو مگر یاد آیا

ایک امت ہے محمدؐ کی حسن
گمشدہ ہے یہ خبر یاد آیا

خرم خلیق

نعت

انوار الٰہی کا خزینہ ہے مدینہ
مومن کے لیے وادیٔ سینا ہے مدینہ

یثرب تھا کبھی جب نہ تھے اس دل میں محمدؐ
اب ان کی سکونت سے یہ سینہ ہے مدینہ

ہاں ہوگی کہیں اس کے مضافات میں جنت
منزل تو مسافر کی مدینہ ہے مدینہ

تھی ایک ہی طوفاں کیلئے نوح کی کشتی
پر سارے زمانوں کا سفینہ ہے مدینہ

ہے بیش بہا اس کے دمکنے سے یہ خرم
انگشتری دنیا ہے نگینہ ہے مدینہ

گفتارِ خیالی

نعتیہ نظم

لمحوں کی دیوار گرا کر دیکھو تو اس پار — کانٹوں پہ وہ چلنے والا پھول کھلاتا جائے

عرش بریں سے آتا ہے وہ دنیا کا مختار — دشمن کے پتھر کھا کھا کر خون بہاتا جائے

مٹی کو سونا کرتا ہے آگ کو وہ گلزار — بھولے بھٹکے انسانوں کو راہ دکھاتا جائے

ساری دنیا اسؐ کی رعایا وہ سب کا سردار — لیکن پھر بھی رحمت کا انبار لٹاتا جائے

سورج اس کے پاؤں کی مٹی کے ذرّے کا مول — اس پارس سے مَس ہو جائے تو بن جاتا ہے سونا

اس کی رحمت بن کے دولت بھر دے ہر کشکول — اُسؐ کا کام ہے کشفِ خرد میں احساسات کا بونا

عاجز ہوں تفسیر سے صدیاں اس کا ایسا بول — اُس کی ہستی کے ہونے سے ہے کونین کا ہونا

ذرہ بھر بھی ہو نہیں سکتا جسؐ کی بات میں جھول — ورنہ دنیا میں کیا ہے یہ دنیا ایک کھلونا

غارِ حرا میں بیٹھنے والا، دشت و جبل پر بھاری — اس کی عادت سب سے اچھی اس کی خصلت نیک

اسؐ کی ذات کی ہیبت سے قطبین پہ لرزہ طاری — اس کی ہستی ایسا ستوں ہے جو افلاک کی ٹیک

فیض کا چشمہ ایسا ہے اس کا صدیوں سے جاری — بکھرے ہوئے لوگوں کو کردے جو پل بھر میں ایک

اسؐ کی بصیرت ایسی جس سے چھپ نہ سکے عیاری — کفر کا خرمن خاک بنائے اس کی فکر کی سیک

اس کی محبت میں جلتے ہیں حیدرؓ اور عثمانؓ
اس کی رفاقت میں صدیوں کی ہستی کا عنوان
وہ فاروقؓ کی عظمت پر ہے اک مُہرِ عرفان
وہ صدیقؓ و صحابہ کے ہے سینوں کا ارمان

تابش دہلوی ☆

☆

رندی مری مُہلک نہیں سفاک نہیں ہے
ساغر میں مرے گردشِ افلاک نہیں ہے

تہذیبِ تماشا سے ہے واقف نگۂ شوق
نظارگیِ حسن میں بے باک نہیں ہے

دنیا ہی میں رہ کر رہو دنیا کے مقابل
گرداب سے ڈر جائے وہ پیراک نہیں ہے

جامے کی طرح چاک ہو دیوار چمن بھی
محدود جنوں تا حدِ پوشاک نہیں ہے

کیوں کر ہمیں معلوم ہو دنیا کی حقیقت
ہم بھی ہیں؟ اس کا ابھی ادراک نہیں ہے

ہے قافلۂ شوق کی راہوں کا اُجالا
خاکِ قدمِ اہلِ طلب خاک نہیں ہے

ہوتے رہے جذب اس میں مرے اشکِ ندامت
صد شکر کہ دامن مرا ناپاک نہیں ہے

صیاد ہی صیاد ہیں ہر کنجِ چمن بھی
نخچیر سے خالی کوئی فتراک نہیں ہے

دھندلائے ہوئے ہیں مری دنیا کے مناظر
تابش نگۂ شوق تو نمناک نہیں ہے

☆ تابش صاحب مرحوم باقاعدگی سے اپنی نگارشات "کالاقریا" کے لیے عطیہ فرماتے رہے۔ زیر نظر غزل مرحوم کا آخری عطیہ ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں عقبیٰ و آخرت میں بلند مراتب عطا فرمائے آمین (ادارہ)

صادق نسیم

☆

یہ رسم تیری گلی کی عجیب ہی سی لگے
ہر آنکھ میری طرف دیکھتی ہوئی سی لگی

کبھی کبھی جو میں اپنی تلاش میں نکلوں
تو آئینے میں بھی شکل اجنبی سی لگے

بساطِ ناز پہ تُو ہے کہ کوئی تجھ سا ہے
کہ آج بزمِ دل و جاں سجی سجی سی لگے

یہ کس نے آج درِ دل پہ آکے دستک دی
ہوا خنک سی لگے درد میں کمی سی لگے

خیال و خواب میں کلیاں کھلی کھلی سی لگیں
کسی کی یاد میں بزمِ غزل سجی سی لگے

یہ کس کی یاد نے مہکا دیے ہیں دیدہ و دل
فضا میں کیف گلوں میں شگفتگی سی لگے

وہ خوش گماں ہوں کہ اکثر مری نگاہوں کو
شبِ سیاہ کے پردوں میں روشنی سی لگے

نظر جھکاؤں تو رسنے لگیں پرانے زخم
نظر اٹھاؤں تو دنیا نئی نئی سی لگے

کچھ اتنی تیز ہے رفتارِ کائنات نسیم
کہ اب ہر ایک ملاقات سرسری سی لگے

عبدالعزیز خالد

☆

بیانِ حُسن کے پردے میں کرتے ہیں شارب کی
کبھی سیدھے سبھاؤ کی نہ ہم نے بات مطلب کی

مقام و نام کی تبدیلیوں سے ہر زمانے میں
زدِ حجاج میں اولاد رہتی ہے ثعلب☆ کی

فلاطونی محبت مرد و زن میں کیسے ممکن ہے
حکایت درمیاں میں آ ہی جائے عارض و لب کی

فروغِ فکر و فن کا ذکر بس باتوں کی حد تک ہے
کسی شے کی عملداری ہے گر تو مال و منصب کی

بجھادی شمعِ حکمت گرد و بادِ خود نمائی نے
نمائش علم کے پردے میں ہے جہلِ مرکب کی

یوں دھوکا دیں خدا کو جس طرح بہلائیں بچوں کو
زمانہ ساز ہیں کیا پوچھتے ہو ان کے مذہب کی

شعورِ ذات بخشا مجھ کو افکار و حوادث نے
رفیقِ راہ بنتی ہے کہاں تعلیم مکتب کی

حسینوں سے مرا ناتا ہے بس ہنس بول لینے کا
کہ خو بو مجھ میں ہے آزادگانِ پاک مشرب کی

کبھی میں تُو تھا تُو میں تھی پہ اب میں میں ہوں تُو تُو ہے
سحر کر بن گئی خوابِ پریشاں داستاں شب کی

وفا کرتی ہے کب تک زندگی کیا جانئے خالدؔ
جوانی مہوشانِ آشنا کی ڈھل چکی کب کی!

☆ واں آمدہ بر جانِ من از ہر کہ باید ... از کینۂ حجاج بر اولادِ ثعلب

رشید الدین وطواط

سید محمد حنیف اخگر ملیح آبادی☆

☆

وہ اشکِ غم کہ ضبط کی حد سے گزر گئے
دامن پہ اس کے گویا ستارے بکھر گئے

دنیائے دل کو کر کے جو زیر و زبر گئے
ناز و ادا کے ساتھ جفا سے مکر گئے

کارِ دل و نگاہ پہ سوچا تو ڈر گئے
نظروں میں کیا جچیں گے جو دل سے اتر گئے

آئینہ چور چور کیا اُس نگاہ نے
ہر سُو زمیں پہ خواب ہمارے بکھر گئے

اعجازِ انہماکِ جبہ سائی دیکھئے
لوحِ جبین و نقشِ کفِ پا نکھر گئے

برکت سے ایک نام کی بے شک خدا گواہ
لمحوں میں کچھ پہاڑ سے عرصے گزر گئے

دار و رسن سے کوچۂ جاناں تک آئے ہم
باقی نہ جانے آپ کے عاشق کدھر گئے

ممکن نہیں کہ موت سے پہلے وہ آسکے
اخگر یہ سوچ سوچ کے بے موت مر گئے

☆

گمانِ صبح ہے مبہم تو کچھ عجب بھی نہیں
کہ شام ہی سے یقینِ نزولِ شب بھی نہیں

ہمیں سکون جو پہلے نہ تھا سو اب بھی نہیں
مگر یہ شدتِ ہیجان بے سبب بھی نہیں

اُنہیں بھی میری وفاؤں پہ ناز ہوگا مگر
یہ اعتراف ابھی تک تو زیرِ لب بھی نہیں

ہر اک خوشی ہے بہ باطن کمالِ حزن مگر
نشاطِ غم کا بہ ظاہر کوئی سبب بھی نہیں

نہیں ہے ہوش مگر ہے وہ نام لب پہ ہنوز
میں جاں بہ لب ہوں مگر ایسا جاں بہ لب بھی نہیں

کمالِ شدتِ حرماں ہے دیدنی اخگر
یہ چشم نم بھی نہیں میں فغاں بہ لب بھی نہیں

☆ محترم اخگر صاحب ایک طویل مدت سے نیویارک (امریکہ) میں مستقل رہائش پذیر ہیں۔ آپ کے تین مجموعہ ہائے کلام "مطلعِ مجسم" (نعتوں کا مجموعہ) "چراغاں" اور "خیاباں" (غزلوں کے مجموعے) شائع ہو چکے ہیں۔ آپ نیویارک میں "حلقۂ فن و ادب" کے موسس اور صدر ہیں۔ ہم ممنون ہیں کہ اخگر صاحب نے آسٹرو قلمی تعاون کی نوید کے ساتھ "اوراق" کو اپنا تازہ کلام عطیہ فرمایا ہے۔ (ادارہ)

اکبر حیدرآبادی

(آکسفورڈ۔ برطانیہ)

☆

بے ارادہ میں جدھر جا نکلا
راستہ اس کے ہی گھر کا نکلا

جس سے شکوہ کیا تنہائی کا
وہ بھی میری طرح تنہا نکلا

اک ذرا تارِ نفس کیا ٹوٹا
جسم کا بوجھ بھی ہلکا نکلا

دل کی اب اور وضاحت کیا ہو
ایک کاغذ تھا جو کورا نکلا

جامۂ حرص پہن کر دیکھا
یہ مرے جسم پہ چھوٹا نکلا

بن بلائے وہ مرے گھر آیا
چلو اک خواب تو سچا نکلا

ہر طرف پیاس بچھی تھی اکبر
کس خرابے میں یہ دریا نکلا

☆

زوالِ مہر کی ساعت ہے فکرِ شام کرو
مصر ہے رات کہ جشنِ مہ تمام کرو

اٹھا چکے بہت احسانِ ساغر و مینا
کرو رجوع اُن آنکھوں سے، ترکِ جام کرو

کسی خیال کی وحشت کا دل پہ زور سہی
مگر اب اس کے لیے نیند کیوں حرام کرو

ہے کیا عجب کہ شہادت ہی نکل آئے
ابھی سے فیصلۂ دل نہ اپنا عام کرو

اداس اداس ہے مہماں سرائے دل کب سے
چلے بھی آؤ کوئی شب یہاں قیام کرو

کسی نے جو نہ کہی ایسی کوئی بات کہو
کسی نے جو نہ کیا ایسا کوئی کام کرو

ہے فرش کانچ کا اکبر زمیں محبت کی
ذرا سنبھل کے چلو اس پہ جب خرام کرو

محسن احسان

☆

دنیا نے ہوس میں دیں نہیں ہے — گم گشتۂ راہ کیا کریں گے
لگتا ہے خدا کہیں نہیں ہے — یہ انجم و ماہ کیا کریں گے

سب خواب ہوئے ہیں راکھ میرے — دو وقت کی مل گئی بہت ہے
اس دل کو مگر یقیں نہیں ہے — ہم تخت و کلاہ کیا کریں گے

جو لوح ضمیر پہ لکھا ہے — تقسیم ثواب کی رتوں میں
بچ ایسا رقم کہیں نہیں ہے — مجبور گناہ کیا کریں گے

دیکھو تو معتمان فن کا — میں اپنی صداقتوں کا مجرم
ہے کون جو خدشہ گیں نہیں ہے — یہ میرے گواہ کیا کریں گے

بازار کمال چھان مارا — بس اتنا پتا چلا عریاں
سامان ہنر کہیں نہیں ہے — محتاج نگاہ کیا کریں گے

کب تک ستون طعنِ بے وفائی — اے زندگی آخری دنوں میں
جا تجھ سے وفا نہیں نہیں ہے — ہم تجھ سے نباہ کیا کریں گے

سنگِ دربار تک پہنچ کر — ہم رو کے خموش ہو گئے ہیں
شرمندہ مری جبیں نہیں ہے — نا واقفِ آہ کیا کریں گے

☆

امتیاز ساغر

☆

اس انجمن سے کیا اٹھے وحشت لئے ہوئے
دامن میں آ گرے ہیں ستارے بجھے ہوئے

کل تک طلسمِ ذات کے کھلنے کی فکر تھی
اب میں ہوں چشمِ شوق میں حیرت لئے ہوئے

کچھ دائروں میں قید ہے باہر کی زندگی
کچھ دائرے ہیں ذات کے اندر بنے ہوئے

مجھ بے قرار کو اُسی محفل میں لے کے چل
مدت ہوئی ہے اپنا تماشا کئے ہوئے

صحرا پہ ابر چھایا برس کے گزر گیا—
اب کس کے منتظر ہیں دریچے کھلے ہوئے

ثابت ہوا کہ مجھ سے ہی قائم ہے بزمِ شوق
میں چل پڑا تو چل پڑے لمبے رکے ہوئے

سید مشکور حسین یاد

☆

دنیا کو بھلا دین میں کیا بدلو گے
اس پیاس کو تسکین میں کیا بدلو گے

دو ان کو کسی حسن عمل کی تعبیر
خوابوں کو مضامین میں کیا بدلو گے

تم ایک نہیں اپنی جگہ لاکھوں ہو
اس ایک کو دو تین میں کیا بدلو گے

موجود ہیں جب آنسوؤں کے نقش و نگار
پھر مصحفِ تزئین میں کیا بدلو گے

ہے پیار اگر جرم تو ہے پھول سا جرم
اس پھول کو سنگین میں کیا بدلو گے

کہتے ہو بُرا کہتے رہو یاد ہمیں
اس پیار کو تحسین میں کیا بدلو گے

انور شعور

☆

کچھ رات ڈھلے گی تو خمار آنے لگے گا
اوسان میں یہ بادہ گسار آنے لگا گا

تم آنے لگو گے تو کسی کام ہمارے
یہ سلسلۂ لیل و نہار آنے لگے گا

پیدا ہوئے آثار اگر موسمِ گل کے
ہر چیز کے گالوں پہ نکھار آنے لگے گا

آتا ہے تو آتا ہے قرار اُن کے جلو میں
وہ آنے لگیں گے تو قرار آنے لگے گا

اب گھر کے در و بام اسی روز سجیں گے
جب لوٹ کے رُوٹھا ہوا یار آنے لگے گا

آئینہ ذرا غور سے دیکھو گے تو مجھ پر
غصے کے بجائے تمہیں پیار آنے لگے گا

کچھ دیر شعور اور بجھو داغِ جگر کے
قابو میں ستاروں کا شمار آنے لگے گا

☆

بُرا بُرے کے علاوہ بھلا بھی ہوتا ہے
ہر آدمی میں کوئی دوسرا بھی ہوتا ہے

تم اپنے وصل کی سوغات ہو ہمارے لیے
کہ حُسن تحفۂ آب و ہوا بھی ہوتا ہے

مقابلے پہ کمربستہ ہم نہیں ہوتے
اگر شکست کا خطرہ ذرا بھی ہوتا ہے

تمہارے شہر میں ہے جی لگا ہُوا ورنہ
مسافروں کے لیے راستہ بھی ہوتا ہے

وہ چہرہ ایک تصور بھی ہے، حقیقت بھی
دریچہ بند بھی ہوتا ہے، وا بھی ہوتا ہے

ہمیں وہ اپنی طرف دیکھتا نہیں لگتا
اگر ہماری طرف دیکھتا بھی ہوتا ہے

ہم اے شعور اکیلے کبھی نہیں ہوتے
ہمارے ساتھ ہمارا خدا بھی ہوتا ہے

ڈاکٹر خیال امروہوی

☆

بنامِ آگہی یورش اگر آشفتہ سر کر دیں
فصیلِ آہنی میں ضربتِ ایقاں سے در کر دیں

جہانِ جبر کو ہر دم یہی خلجان رہتا ہے
کہیں ایسا نہ ہو ذرات کو شمس و قمر کر دیں

کچھ ایسے نابغہ بھی ہیں جو عزم التہابی سے
شبِ یلدا کا سینہ چیر کر پیدا سحر کر دیں

شفق اک دن بجائے رنگ انگارے نہ برسائے
کہاں ہیں پیشہ ور جلاد انکو باخبر کر دیں

فقط بالشت بھر میداں میں کیوں ہو رزم آرائی
جسارت ہے تو پھر قطبین تک زیر و زبر کر دیں

کہاں سے ہاتھ آئیں آج وہ اقدار انسانی
جو انساں سے کریہہ الفعل کو فوق البشر کر دیں

کہیں بیدار جادہ رو سرِ منزل نہ جا پہنچیں
نشیلے کارواں رفتار اپنی تیز تر کر دیں

نظامِ رہبری کا اولیں اعلامیہ یہ ہے
جہاں بیدار دل پائیں انہیں کشور بدر کر دیں

ندامت نے کچھ اتنا غم دیا اب جی میں آتا ہے
کہ ایسی گریہ و زاری کریں شب سے سحر کر دیں

خیال آفاقی

☆

جو ساز لفظ و معانی سے بے نیاز نہیں
وہ نغمہ شکوۂ تاثیر کا مجاز نہیں

متاعِ بخششِ محمود کھو گئی شاید
کوئی شمارگرِ دانشِ ایاز نہیں

نہ طائرانِ شبستاں ہیں ہمکلامِ سحر
ادائے شامِ غریباں بھی دل نواز نہیں

اذان سن کے فقط سر جھکا دیا بھی تو کیا
دل و نگاہ اگر خوگرِ نماز نہیں

ملے بھی کیسے سراغِ شعورِ آگاہی
کوئی ضمیر ہی وابستۂ حجاز نہیں

رہے خیال کہ تو بھی شعورِ شوقِ طلب!
شریکِ کار سہی، میرا کارساز نہیں

یہ آب و رنگِ گل کا فسوں ہے وہ رنگ و بو کا فریب
مرے جہانِ نظر میں یہ امتیاز نہیں

تو میرے دل سے خبردار، روح سے واقف
تری نگاہ سے پوشیدہ کوئی راز نہیں

خیالِ کارِ جنوں خنجر میں تامل کیا
سنا ہے، گیسوئے لیلیٰ شبِ دراز نہیں

مضطر اکبرآبادی

☆

ادا چمن کی محبت کا حق جو کرتا تھا
تو دل کے خون سے پھولوں میں رنگ بھرتا تھا

کسی کا ساتھ جوانی کہاں تلک دیتی
کبھی تو اس چڑھی ندی کو بھی اترنا تھا

کڑکتی' جبر کی یہ برق بے اماں کب تک
کبھی تو وقت کی اس رو کو بھی ٹھہرنا تھا

یہ کیا کہ پڑ گیا تو ماند ابھی سے اے مرے چاند
تجھے تو اور مرے غم ابھی نکھرنا تھا

متاعِ درد! یہ دل منتظر ہے کب سے ترا
کبھی ادھر بھی تجھے التفات کرنا تھا

چلو کہ چھوٹی انا آج ساتھ چھوڑ گئی
یہ نشہ ایک نہ اک دن ضرور اترنا تھا

تھی زیست ریت کی دیوار' موت آندھی تھی
وہ شے بکھر گئی آخر جسے بکھرنا تھا

ملا تو تھا کہ بچھڑ بھی گیا کوئی مجھ سے
اس امتحاں سے بھی مضطر مجھے گزرنا تھا

سرور انبالوی

☆

نہ کھیلیں جس میں بچے ایسا گھر اچھا نہیں لگتا
نہ چہکیں جس پہ پنچھی وہ شجر اچھا نہیں لگتا

مری سوچوں کا محور ہو کے بھی تم اجنبی ٹھہرے
پڑوسی سے پڑوسی بے خبر اچھا نہیں لگتا

انہیں منزل پہ جا کر موت کا پیغام آتا ہے
مجھے کونجوں کی ہجرت کا سفر اچھا نہیں لگتا

ہم اپنے آپ آ کر لٹ گئے بازار ہستی میں
فقیروں کے گھروں میں مال و زر اچھا نہیں لگتا

لبوں سے چھین کر سچائی دیواروں میں چنوا دو
چڑھائیں لوگ اس کو دار پر اچھا نہیں لگتا

مرے نقش قدم آخر مرے دشمن نہ بن جائیں
مجھے یہ برف زاروں کا سفر اچھا نہیں لگتا

اسے خود کاٹ کر میں عدل کی سولی پہ لٹکا دوں
جھکے ظالم کی چوکھٹ پر یہ سر اچھا نہیں لگتا

یہ دشمن روشنی کے اور سورج سے ہے کد ان کو
یہ اندھے ہیں انہیں نورِ سحر اچھا نہیں لگتا

جڑیں اپنی زمیں میں ہوں نہ جس کی وہ شجر کیسا
سرور انبالوی اس پر ثمر اچھا نہیں لگتا

منصور عاقل

☆

درویشِ خدامست بھی صد رشکِ شہاں بھی
ہم سنگِ سرِ راہ بھی ہیں کوہِ گراں بھی

حیرت کدۂ ہستی ہے عجب آئینہ خانہ
خود منظر و ناظر بھی ہے چشمِ نگراں بھی

جو کلکِ مشیت سے ہے منسوب وہ اک حرف
ہے میری حکایت بھی حدیثِ دگراں بھی

صورت کے پرستار ہیں سیرت سے ہے اغماض
زندانیٔ الفاظ ہیں معنی نگہاں بھی

ہر دل پہ لگائے ہیں گل ولالہ نے وہ زخم
آزردۂ اسباب ہیں صاحب نظراں بھی

ہم غم زدگاں کیا دل صد چاک کو سیتے
اپنے ہی تاگے تھے یہی اشکِ رواں بھی

ہر قہر پہ آمادہ ہیں ہر جبر پہ قادر
شمشیر بکف بھی ہیں وہ ناوک بکماں بھی

یہ دل ہی پریشاں نہیں احوالِ چمن پر
گھبرائی ہوئی سی ہے نسیمِ گزراں بھی

زنجیر کیے لوح و قلم کج ہنروں نے
ہے نوحہ بلب دانش و حکمت کا جہاں بھی

اس قافلۂ بے جہت و بے خبراں میں
اے کاش کہ بیدار ہو احساسِ زیاں بھی

توقیرِ چمن چاہیے ہر حال میں عاقل
تعظیمِ بہاراں بھی ہو تکریمِ خزاں بھی

عقیل دانش

(لندن۔ برطانیہ)

☆

غزل کو حاملِ صد اعتبار کرتے رہو
جو ہو سکے تو زمانے سے پیار کرتے رہو

ستم کی رات کو تاریخ کے حوالے کرو
اور اس کے بعد سے لمحے شمار کرتے رہو

زبانِ شعر کو تلوار کی صفت دے کر
لباسِ ظلم و ستم تار تار کرتے رہو

کبھی کبھی تو روایت بھی لطف دیتی ہے
غزل میں تذکرۂ گلعذار کرتے رہو

حصولِ حکمت و دانش یہاں خطا ٹھہرا
یہی خطا ہے تو پھر بار بار کرتے رہو

☆

ہوش میں بھی اُن کو بھولے یہ ستم کرتے رہے
زندگی کے قیمتی لمحات کم کرتے رہے

آنسوؤں کا خون مژگاں کا قلم قرطاسِ دل
ہم پہ جو گزری بہر صورت رقم کرتے رہے

ذہن میں روشن ہیں اب بھی ان کی یادوں کے چراغ
خونِ دل ہم ان چراغوں کو بہم کرتے رہے

ان نصیبوں پر ہمیں عمر خضر کی دی دعا
دوست دانستہ تو گویا اک کرم کرتے رہے

حرف کی حرمت پہ دانش جان ہم نے نذر کی
اور وہ حق گوئی پہ ہر سر قلم کرتے رہے

جعفر بلوچ

☆

غم اپنا چھپانا ہے ہمیں طوعاً و کرہاً
ہنسنا ہے ہنسانا ہے ہمیں طوعاً و کرہاً

کرنا ہے بلند اور بھی معیار وفا کو
اور خود کو مٹانا ہے ہمیں طوعاً و کرہاً

ساقی ہو اگر چیں بہ جبیں دیکھ کے ہم کو
پیاسا پلٹ آنا ہے ہمیں طوعاً و کرہاً

اس سمت میں شاید متوجہ وہ صنم ہو
حال اپنا سنانا ہے ہمیں طوعاً و کرہاً

ناخواندہ وہ مہماں ہے ہمارا مگر اس کا
ہر ناز اٹھانا ہے ہمیں طوعاً و کرہاً

سہنی ہے سزا اپنے کیے کی خوش و ناخوش
یہ قرض چکانا ہے ہمیں طوعاً و کرہاً

کرتا ہے مختربود کوئی ظلم جہاں کو
مصرع یہ اٹھانا ہے ہمیں طوعاً و کرہاً

جعفر تری تقریب وصال آئی ہے سر پہ
یہ جشن منانا ہے ہمیں طوعاً و کرہاً

گلنار آفریں

☆

ہجومِ شامِ غم میں تیرگی ہی تیرگی ہوگی
جلیں گے داغِ دل تو شہر بھر میں روشنی ہوگی

فرازِ دار تک ہی سلسلہ ہے آزمائش کا
اور اس کے بعد ہم ہوں گے نہ اپنی زندگی ہوگی

ہر اک قوسِ قزح کا رنگ جیسے اس میں شامل تھا
یہ ایک تصویر تیری کتنے رنگوں سے بنی ہوگی

کبھی تو وحشتِ دل دشتِ غم میں ساتھ چھوڑے گی
کبھی تو آرزوئے سایۂ دیوار بھی ہوگی

یہ دور مصلحت آمیز ہے ہر بات ممکن ہے
ہے جس سے دوستی اپنی کل اس سے دشمنی ہوگی

گھٹا سبزہ دھنک مہتاب کلیاں پھول اور شبنم
نسیمِ گلستاں کس کس کی آخر بندگی ہوگی

غریبِ شہر تو سچ بات کہہ کر چل دیا ہوگا
امیرِ شہر کی نظروں میں شکن بڑھی ہوگی

وفا دشمن سمجھ کر بھی نہ سمجھیں تو شکایت کیا
ہر اک الزام کی گلنار نے تردید کی ہوگی

پروفیسر زہیر کنجاہی

☆

زمیں تھرا اٹھی لرزش میں قصرِ آسماں آیا
قیامت بن کے جب گلشن میں وہ جانِ جہاں آیا

جھکی جاتی ہے گردن خود بخود جوشِ محبت میں
مبارک اے جبینِ شوق! ان کا آستاں آیا

مقدر سے اسی دم نیند بھی آنے لگی اُن کو
اثر پر جب ہماری سرفروشی کا سماں آیا

ہر اک کو الغرض دنیا میں لائی جستجو تیری
کوئی کعبہ میں جا پہنچا کوئی سوئے بتاں آیا

بزرگوں کی دعائیں مجھ کو اکثر راس آئی ہیں
مقدر میں مرے ہر دم انوکھا ارمغاں آیا

زہیرؔ آتے ہوئے دیکھا جو مجھ کو سوئے مے خانہ
مچایا شور رندوں نے کہ وہ پیرِ مغاں آیا

نورالزماں احمد اوجؔ

☆

کیا اس سے عبارت ہیں خیالاتِ حسیں بھی
پُر کیف نظر آتی ہے شعروں کی زمیں بھی

یہ کیسا زمانہ ہے سمجھ میں نہیں آتا
بے پردہ نظر آئے ہیں کچھ پردہ نشیں بھی

جب یاس کی موجوں نے کنارے کا نہ رکھا
اب ڈوبے مری کشتی نہ امید کہیں بھی

وہ دعوتِ نظارہ کا قائل ہے بہر بزم
میں ہوں کہ کم آمیز بھی ہوں گوشہ نشیں بھی

کیا بات ہے افسردہ سے آتے ہیں نظر آج
کیا بات ہے تر آج ہے وہ چشمِ حسیں بھی

اس بار گہِ ناز میں کیا کام ادا کا
جھکتے ہوئے دیکھے ہیں یہاں عرش نشیں بھی

کس موڑ پہ لے آئی مجھے اوجؔ محبت
اب یاد نہیں آتی ہے وہ زہرہ جبیں بھی

ارشد محمود ناشاد

☆

خاکِ خموش کو کبھی ولولۂ نمو بھی دے
باغِ خزاں گزیدہ کو لذتِ رنگ و بو بھی دے

تشنگیٔ وجودِ گل، وقفِ سراب تا بہ کے ؟
اے مرے بحرِ آفریں! جام بھی دے سبو بھی دے

شامِ فراق کو کہیں غیرتِ صبحِ وصل کر
کنجِ اسیرِ عشق کو شوکتِ کاخ و کو بھی دے

گرچہ ہے وجہِ سوز و ساز خلوتِ بے صدا یہاں
ہاں مگر اے زمانہ گیر! جلوتِ ہاؤ ہو بھی دے

لوحِ زوال پر کوئی حرف بقا بھی ثبت ہو
موت سے ہم کنار کر، جینے کی آرزو بھی دے

عرصۂ وہم میں کہیں حرفِ یقیں چمک اٹھے
میرے کسی سوال کا کوئی جواب تو بھی دے

عمران احمد خاں

☆

خیالِ وصل کا منظر بکھرتا جاتا ہے
وہ اپنے عہدِ وفا سے مکرتا جاتا ہے

وہ خواب جس کو جنوں نے کبھی تراشا تھا
رہِ حصولِ تمنا میں مرتا جاتا ہے

وہ رنجگی ہے بہ فیضِ غمِ زمانہ کہ اب
محبتوں کا نشہ بھی اترتا جاتا ہے

بکھرتی جاتی ہے تیرے وصال کی خواہش
ترے فراق کا موسم ٹھہرتا جاتا ہے

مری نگاہ سمیٹے ہے دشتِ امکاں کو
مرا جنوں مجھے تعمیر کرتا جاتا ہے

جو کام کرنے ہیں عمران ہو سکیں پا لے
جو دسترس میں ہے لمحہ، گزرتا جاتا ہے

قمر رعینی

رباعیات

جو بات بھی لکھتا ہے سمجھے کوئی
مل جائے گا مجھکو صلۂ حق کوئی
اپنوں نے کچھ اس طرح چمن کو لوٹا
پھولوں سے گلے مل کر خوشبو روئی

اونچا علم نام و نسب کرتے ہیں
سعئ طلب رضائے رب کرتے ہیں
حق یہ ہے قابل ستائش ہیں وہی
جو لوگ بزرگوں کا ادب کرتے ہیں

ماضی میں کسی نے نہ یہ سوچا ہوگا
اللہ کے گھر میں بھی دھماکہ ہوگا
قابو میں اگر آ نہ سکے دہشت گرد
اے اہل وطن سوچو کہ پھر کیا ہوگا؟

چہرہ تو حسیں لیکن دل کالا ہے
وہ نشۂ منصب سے متوالا ہے
ہے ورد زباں آپ کا خادم ہوں میں
پر دل میں انا ربکم الاعلیٰ ہے

مجرم کو تو حق دار سزا کہتے ہیں
اس باب میں کیا اہل وفا کہتے ہیں
گلشن جو لٹا دے وہ لعین و مردود
جو بخش دے اس کو اسے کیا کہتے ہیں

کب فکر انھیں عالم بالا کی ہے
ہر بات میں کھل فریب چالاکی ہے
مقصد کے حصول کا ہے زینہ مذہب
خواہش انھیں اقتدار اعلیٰ کی ہے

دم اپنے دشمن کا بھرنے والے
لیلائے وزارت پہ مرنے والے
کس منہ سے خدا کے روبرو جائیں گے
اپنا ہی وطن دولخت کرنے والے

اچھی باتوں میں ردّ و کد کرتے ہیں
لیکن تقلید دام و دد کرتے ہیں
یہ جن کو قرآن ناقص کہیے
کچھ کر نہیں سکتے تو حسد کرتے ہیں

عبدالعزیز خالد

رُباعیات

(۱)

مل جاتی ہے کب حسبِ تمنا ہر شے
محرومی کا ہو سامنا پے در پے
بیش و کمِ اسباب و وسائل خالدؔ!
مقصودِ حیات کے حوالے سے ہو طے!

(۲)

ہو محرئ قدرتِ اسلوب جسے
بذلہ گوئی و نغز گوئی میں فرق کرے
لے جائزہ ہر بات کا بالاستیعاب
رکنے کی ضرورت ہو جہاں رک جائے!

(۳)

جن لوگوں کا ہو مشغلہ بھوگ ولاس
رس پھولوں کا چوسیں، لیں کلیوں کی باس
خمیازہ کشِ حسرت تا عمر رہیں
چشمِ فلک ان کو دکھا دیکھے نراس!

(۴)

ہوتی نہیں کامنا کبھی بھوگ سے کم
کافی نہیں اس کے لیے یہ ایک جنم
مکتی وشے واسنا کو تجنے میں ہے
ادراک ہے اس رمز کا لیکن کم کم!

(۵)

وہ جو کہ تجھے تاجِ جہانبانی دے
ہم کو فقط اسبابِ پریشانی دے
پہنائے وہ عیبی کو لباسِ ساتر
بے عیبوں کو لباسِ عریانی دے! (سرمد)

(۶)

سرما گزرا پہ یہ دل زار وہی
گرما گزرا پہ یہ دل زار وہی
القصہ تمام سرد و گرمِ عالم
ہم پہ گزرا پہ یہ دلِ زار وہی! (سرمد)

(۷)

شہرہ تو کراماتِ وخوارق کا سنا
سن کر سر بھی بارہا ان پہ دُھنا
یہ قصے ہیں وہ کہ قصہ بافوں نے جنہیں
افسانہ واہموں کے کرگوں پہ بُنا!

(۸)

ہوگا ہر روز روزِ محشر مرے بعد
حالاتِ زمانہ ہوں گے ابتر مرے بعد
کرتا ہے یہی سوال ہر مجنوں! کون
بیٹھے گا مسندِ جنوں پہ مرے بعد؟

ڈاکٹر خیال امروہوی

فکری قوس قزح

خلائی دور حیرت ناک ہوگا
وہاں جذبوں سے انساں پاک ہوگا
زمیں کے ذائقوں کا تذکرہ کیا
یہ دل ہوگا نہ یہ ادراک ہوگا

یہ کس نے کہہ دیا کس بل نہیں ہے
قویٰ سالم ہیں ہمت شل نہیں ہے
مسائل کے عزاداروں سے پوچھو
وہ کیا مشکل ہے جس کا حل نہیں ہے

اگر الفاظ تخلیقِ بشر ہیں
تو سارے فلسفے نامعتبر ہیں
جنہیں مابعدِ ہستی کا ہے عرفاں
وہ اپنی اصل سے بھی بے خبر ہیں

سفیدی کنپٹی پر آ چکی ہے
سزا عمرِ فسردہ پا چکی ہے
شبابی صورتیں کیا لطف دینگی
جوانی زخم دیکر جا چکی ہے

سہارے ہیں عجب ایمان و دیں کے
ولا سے جا بجا خُلدِ بریں کے
زمیں والے خلا میں جا بسے ہیں
کھلے ہم پر نہ سرچشمے زمیں کے

بہت کر لی سلف کی سوگواری
عقاید میں دکھا دی جاں نثاری
قدامت کیا کریگی عصرِ نو میں
دگرگوں ہو چکی دنیا ہماری

مرے الفاظ برچھی کی انی ہیں
کہ تاثیرات ان کی سنسنی ہیں
اگر حل ہوں تو ان میں کیمیا ہے
جو رہ جائیں تو ہیرے کی کنی ہیں

امارت میں غریبوں کی حمایت
ریاکاری ہے سچائی نہیں ہے
غریبی میں امارت کی تمنا
فریبِ دل ہے، دانائی نہیں ہے

نظر نقاشِ نقشِ کافری ہے
کمالِ دستکاری، آذری ہے
سیاست ہو خطابت ہو کہ مذہب
بڑی دلکش تری سوداگری ہے

بہت آگے گئی سرمایہ داری
وہ قاروں ہیں جو کل تک تھے بھکاری
توازن دب گیا افراطِ زر میں
چلے کیسے یہاں بادِ بہاری

پروفیسر ڈاکٹر عاصی کرنالی

فیصلہ

پھر اک دن فیصلہ میں نے کیا' میں خواب ہی دیکھوں
اگر تعبیر کی کلیاں نہیں کھلتیں
تو ان خوابوں میں کوئی وادیٔ سرسبز' کوئی گلشنِ شاداب ہی دیکھوں
اگر آنگن میں فصلِ کہکشاں' کشتِ مہر و انجم نہیں اُگتی
تو پھر خوابوں کو آئینہ بنا کر عارضِ مہتاب ہی دیکھوں
اگر خونِ جگر کے لعل' اشکوں کے گہر مقسوم ہیں اپنا
تو خوابوں کی فضا میں کوئی ارضِ گوہریں و خطۂ زرناب ہی دیکھوں
میں صدیوں سے مکان و لامکاں کے پردہ ہائے راز اٹھاتا ہوں
میں خود گم ہوتا جاتا ہوں
کھلی آنکھوں سے جو چہرہ نظر آتا نہیں مجھ کو
تو بند آنکھوں سے' اپنی خوابناک آنکھوں سے اُس کی ایک جھلک' اک جلوۂ نایاب ہی دیکھوں
ہوائیں' نکہتیں' نغمے' ستارے' پھول' خوشیاں' چاہتوں کے بیکراں موسم
محبت کرنے والے دل' چہکتے لب' لہکتے لفظ' شیریں گفتگوئیں مہرباں لہجے
اگر یہ برکتیں زندہ نہیں' یہ رحمتیں' یہ نعمتیں ارضِ بشر سے اٹھ گئی ہیں
سب کے سب سرخاب مردہ ہو چکے ہیں' تب میں خوابوں میں پرِ سرخاب ہی دیکھوں

وہ پہلا خواب، جو دل کی گزرگاہوں سے چل کر آنکھ کی منزل میں آیا

بہت محشر خرام و فتنہ ساماں تھا

کہ وہ خواب پریشاں تھا

وہ اک پتھر تھا جس کی ضربتوں سے

ریزہ ریزہ ہو گیا آئینۂ دل

ہزاروں کرچیاں اڑ کر ہوئیں پیوست آنکھوں میں

اور اس کے بعد یہ حالت ہے میری

جو آنکھیں بند کرتا ہوں تو میری پتلیاں ان کرچیوں سے کٹنے لگتی ہیں

جو آنکھیں کھولتا ہوں خون رس رس کر میرے چہرے پہ بہتا ہے

بس اب میں خواب اور تعبیر کے مابین اک بے نام سی سفاک سی وادی میں غلطاں ہوں

نہ خواب اپنے، نہ تعبیریں

نہ رنگ اپنے، نہ تصویریں

نہ سوچ اپنی، نہ تحریریں

نہ خندہ ہے، نہ گریہ ہے

نہ جلنا ہے، نہ بجھنا ہے

نہ جینا ہے، نہ مرنا ہے

سید تابش الوری

کون آیا

کون آیا مرے دروازۂ دل پر اس وقت
اس سے کہدو کہ ملاقات نہیں ہو سکتی
میں تو خود سے بھی بہت دور نکل آیا ہوں
ایسے عالم میں کوئی بات نہیں ہو سکتی
آنے والے نے بہت دیر لگا دی شاید
صبر کی حد بھی تو ہوتی ہے بھلا دی شاید
واہمے کیسے اندیشے بپا ہوتے ہیں
ہم کہ دل والے ہیں کیا جانیں یہ کیا ہوتے ہیں
فیصلے دل کے دماغوں سے ہوئے ہی کب ہیں
دن کے اُجیالے چراغوں سے ہوئے ہی کب ہیں
حسن جب بھی کسی گوشے سے صدا دیتا ہے
دل اُسے وقت کی آواز بنا دیتا ہے
دل کہ مٹی کے گھروندے کی طرح نازک ہے
ٹوٹ جائے تو کسی طرح سے جڑتا ہی نہیں
دل اناؤں کا پرندہ ہے فلک پیما ہے
آگے بڑھ جائے تو پیچھے کبھی مڑتا ہی نہیں
کون آیا مرے دروازۂ دل پر اس وقت
اس سے کہدو کہ ملاقات نہیں ہو سکتی
میں تو خود سے بھی بہت دور نکل آیا ہوں
ایسے عالم میں کوئی بات نہیں ہو سکتی

گلنار آفریں

اے خدا

اے خدا!
تو نے جنھیں قوت ایماں بخشی
عزت نفس عطا کی ہے جنھیں
اے خدا! آج اُسی قوم کو
دنیا سے مٹانے کے لئے •
اس کے اطراف صف آرا ہیں
نصاریٰ و یہود
اے خدا!
اس کے تصرف میں وسائل ہیں زمانے بھر کے
ساری دنیا کی قیادت کا ہے دعویٰ جن کو
زعم طاقت جنھیں
مدعی بھی ہو وہی اور وہی شاہد بھی
اور منصف بھی وہی ٹھہرے ہیں
بے گناہوں کو سر دار چڑھانے کے لئے
اور انھیں صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لئے
اے خدا یہ ترے جانباز
ترے نام پہ جاں اپنی نچھاور کرنے
اپنے ہونٹوں پہ ترے نام کی تکبیر لئے
اپنے اجداد کی عظمت کو بچانے کیلئے
اپنی تہذیب کو غیرت کو بچانے کے لئے
سر بکف جنگ کے میداں میں نکل آئے ہیں
تو انھیں نصرت کامل کی خبر دے مولا
پھر سے آزادی کی پُر نور سحر دے مولا

مسلم شمیم

نذرِ حسرت موہانی

جب بھی اس کو سوچا ہے ذہن کے دریچے میں
روشنی در آئی ہے صبح مسکرائی ہے
جب بھی اس کو سوچا ہے آسمان عظمت پر
ماہتاب ابھرا ہے' آفتاب ابھرا ہے

حسن و عشق کا رشتہ اس کے شعر کی دنیا
اس کی شاعری گویا ہے کدہ محبت کا
آج بھی غزل اس کی آبروئے غزل کی ہے
آج بھی سخن اس کا بانکپن سخن کا ہے

وہ نقیبِ آزادی 'وہ سفیرِ بیداری
وہ سراپا سچائی 'حریت کا سودائی
خیر کی علامت تھا جبرئیل سیرت تھا
وہ ضمیرِ انساں تھا' وہ جمالِ یزداں تھا

جب بھی اس کو سوچا ہے انقلاب کا نغمہ
سازِ فن پہ جاگا ہے' روح میں سمایا ہے
جب بھی اس کو سوچا ہے احترام کا جذبہ
مہر و ماہ کی صورت دل میں جگمگایا ہے

روحِ عصر آنکھوں سے اس کی نور کی صورت
لوحِ جاں پہ پھیلی تھی درد و کرب کی صورت
وہ یقیں کا پیکر تھا 'وہ شعورِ دوراں تھا
وقت کے صحیفے کا ایک باب روشن تھا

حسرت ایک نعرہ ہے جبر سے بغاوت کا
حسرت اک حوالہ ہے خوش نشاں روایت کا
حسرت آج بھی لوگو! قیمتی اثاثہ ہے
حسرت آدمیت کا اک عظیم ورثہ ہے

پروفیسر ڈاکٹر توصیف تبسم

نقد و نظر

نام کتاب: سرکارِ دو عالمؐ

شاعر : سیّد تابش الوری

ناشر : مجلسِ ثقافت پاکستان، بہاولپور

ضخامت : ۱۰۶ صفحات

قیمت : ۱۵۰ روپے

''سرکارِ دو عالمؐ'' سیّد تابش الوری کی حمد و نعت کا مجموعہ ہے، جس میں تین حمدیں اور ۳۴ (چونتیس) نعتیں ہیں جو تمام کی تمام غیر منقوطہ ہیں۔ صنعت غیر منقوطہ علم بدیع کی لفظی صنعتوں میں سے ایک ہے، اس کو ''مہملہ'' یا ''عاطلہ'' بھی کہتے ہیں۔ ''مہملہ'' اس لئے کہ وہ حرف جس پر کوئی نقطہ نہ ہو، وہ ''مہملہ'' کہلاتا ہے۔ گویا شعر یا نثر لکھتے ہوئے لکھنے والا یہ التزام کرتا ہے کہ وہ کوئی ایسا حرف شعر یا عبارت میں نہیں لائے گا جس پر نقطہ ہوتا ہے۔ مثلاً مرزا دبیر کے غیر منقوطہ مرثیے کی ابتدا اس شعر سے ہوتی ہے:

ہم طالع ہما مراد ہم رسا ہوا　　طاؤس کلک مدح اڑا اور اٹھا ہوا

اسی طرح استاد شعراء نے اپنی ہنرمندی اور لفظ و بیان پر اپنی قدرت کے اظہار کے لیے بعض دوسری صنائع سے بھی کام لیا ہے۔ صنعت منقوطہ، صنعت رقطا، صنعت خیفا، صنعت فوق النقاط اور صنعت تحت النقاط، حروف پر لفظوں کی ترتیب اور محل وقوع کے اعتبار سے مختلف نام ہیں۔ صنعت منقوطہ میں، میر انیس اپنی فنی بالیدگی کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

جب بخت بن تھین تے زینت بخشی　　زینب نے تشفی تب بخشش بخشی

تیغیں جز تن، جبینیں شق، بی بی بے چین　　بخت بخشی، نبی نے جنت بخشی

ان شعروں میں جتنے حروف بھی آئے ہیں، کوئی بھی نقطہ کے بغیر نہیں، اسی لیے اس کو "صنعت منقوطہ" کہا گیا ہے۔

"صنعت تحت النقاط" کی مثال، مرزا دبیر کا یہ شعر ہے، جس میں تمام نقطہ دار حروف کے نقطے نیچے واقع ہوئے ہیں:

مارا جو اُسے حیدر کرار کو مارا سردار کو مارا جو علم دار کو مارا

"فوق النقاط" کی مثال یہ شعر دیکھئے، جس کے حروف کے تمام نقطے نیچے نہیں، بلکہ اوپر ہیں:

وہ خوں فشاں، وہ شعلہ، آتش، وہ دم، وہ غم وہ قہر حق، وہ آفت تازہ، وہ تازہ دم

اس گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعری ہو یا کوئی اور فن لطیف، یہ چند اصولوں اور چند پابندیوں کا دوسرا نام ہے۔ شعر کہتے ہوئے، اس کی عام شرائط سے ہٹ کر شاعر اور چیزیں اپنی شاعری کے لیے لازم قرار دے لیتا ہے۔ اس کاوش کا مقصد بغیر اپنی ہنر مندی اور لفظ و بیان پر اپنی قدرت کے اظہار کے اور کیا ہے۔ ظاہر ہے اس صورت میں جو شاعری ہوگی وہ بیشتر دماغی اور شعوری ہوگی۔ سوچنا ہوگا کہ نعت لکھتے ہوئے، عجز و انکسار کے مقابلہ میں ایک طرح کا احساس تفاخر اور خود نمائی کہیں حمد و نعت کی روح کے منافی تو نہیں۔ سید نابش الوری کو حمد و نعت کے لیے، صنعت غیر منقوطہ اختیار کرنے کا یہ خیال اس لئے آیا کہ رب کریم کے اسم گرامی "اللہ" اور خاتم المرسلین کے اسم مبارک "محمدؐ" پر جب کوئی نقطہ نہیں تو پھر کیوں نہ حمد و نعت کے لیے اردو میں ایسے پیرائیہ اظہار کی پابندی کی جائے، جس کا ہر حرف نقطے سے عاری ہو۔ چنانچہ کہتے ہیں:

معراج لطافت پہ ہے نقطہ بھی گراں بار اللہ پہ نقطہ، نہ محمدؐ پہ ہے نقطہ
ہے کلمہ توحید بھی لفظوں سے معرّیٰ حد پہ کوئی نقطہ نہ کہیں شد پہ ہے نقطہ

اُردو فارسی کے قدیم شعراء نے اس خاص صنعت سے کام لینے کی کوشش ضروری کی ہے اور چونکہ یہ مشکل کام تھا، اس لیے اس قسم کی تخلیقات کی تعداد بھی نہایت قلیل ہے۔ مرزا دبیر اور میر انیس کے علاوہ بعض دوسرے مرثیہ نگاروں نے بھی غیر منقوطہ مرثیے کہے ہیں۔ انشاء اللہ خان انشاء کے دیوان میں بھی کہیں کہیں اس صنعت کو برتا گیا ہے۔ ایک ہندو نعت گو شاعر دیو رام نے جن کا تخلص نعت کی مناسبت سے کوثری تھا، صنعت غیر منقوطہ میں متعدد نعتیں کہیں اور ان کو مختصر رسالہ کی صورت میں شائع کیا۔ عہد اکبری کے معروف شاعر، فیضی نے نثر میں اس صنعت کی پابندی کے ساتھ قرآن حکیم کی تفسیر لکھنے کی کوشش کی۔

یہ بڑا مشکل کام تھا، جس سے وہ مکمل طور پر عہدہ برآ نہ ہو سکے۔ موجودہ دور میں جناب راغب مرادآبادی نے اس قدیم صنعت کو زندہ کرنے کی اولین کوشش کی اور نعتیہ غزلوں اور رباعیات پر مشتمل اپنا

مجموعہ "مدحِ رسولؐ" کے نام سے ۱۹۸۳ء میں شائع کیا۔ اس کے بعد اس سلسلہ کا نقشِ ثانی جناب تابش الوری کا نعتیہ و حمدیہ مجموعہ کلام "سرکارِ دو عالمؐ" ہے جو اسی برس شائع ہوا ہے۔ نعت و حمد میں جذب و کیف اور سرشاری کا اپنا مزہ ہے۔ ہزار کوشش کی جائے اس قسم کی مصنوعی جکڑ بندیوں سے اس سرور میں ضرور کمی واقع ہو جاتی ہے جو اہلِ دل نعت و حمد کے شعروں سے کشید کرتے ہیں۔

پروفیسر عاصی کرنالی کے خیال میں شاہد الوری کی ان منظومات میں وہ تمام موضوعات موجود ہیں جو ایک فارسی سلسلہ نعت و ثنا میں شاعر سے توقع کیے جاتے ہیں۔ انہوں نے درجہ بدرجہ ان باتوں کی نشاندہی بھی کی ہے اور اپنے نقطہ نظر کو درست ثابت کرنے کے لیے مناسب شواہد بھی پیش کئے ہیں۔ غرض کہ اردو نعت گوئی کے سرمایہ میں جناب سید تابش الوری کی یہ منفرد کاوش ایک اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ "الحمدللہ" کے عنوان سے انہوں نے جو عرضِ حال کیا ہے، یہ نثر پارہ بھی تمام و کمال غیر منقوطہ ہے، چند شعر بطور نمونہ کلام:

اس کے لیے ہے علمِ کل، اس کے لئے کلام ہے — اس کے لیے درود ہے، اس کے لیے سلام ہے
دل ہے اداس کس لیے، وہم و ہراس کس لئے — مے کدۂ رسولؐ ہے، اور صلائے عام ہے
ردّ سوال ہے کہاں، ہم کو ملال ہے کہاں — اس کی عطا دوام ہے، اس کی دعا مدام ہے
اسکے کرم سے طے ہوئے سارے دلوں کے مرحلے — ولولہ کام کام ہے، حمد و سلام عام ہے
عہدِ الم کے مسئلے، عالمِ کل کے سلسلے — درگہہ سرورِ امم، درس گہہ عوام ہے
کس کی ہے لے گلی گلی، حمد سرا ہے الورؔی — حمد ہی اس کا ورد ہے، حمد ہی اس کا کام ہے

نام کتاب: انشائیہ اور انفرادی سوچ
مصنف : پروفیسر جمیل آذر
ناشر : نقش گر پبلی کیشنز، راولپنڈی
ضخامت : ۱۷۶ صفحات
قیمت : ۱۵۰ روپے

اُردو میں انشائیہ کی صنف ایک عرصہ تک ردّ و کد کا نشانہ بنی رہی۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ اس بحث و تمحیص کے نتیجہ میں انشائیہ کے بحیثیت ایک صنفِ ادب فنی خدوخال واضح ہو گئے۔ یوں اس خاص صنف

ادب کی تفہیم آسان ہوگئی۔ جن لوگوں نے "انشائیہ" کی اس صورت گری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، پروفیسر جمیل آذر کا نام ان میں حد درجہ نمایاں ہے۔ انہوں نے نہ صرف مضامین لکھ کر اس بحث میں حصہ لیا بلکہ خود انشائیے لکھ کر اس کے عملی نمونے بھی پیش کیے۔

"انشائیہ اور انفرادی سوچ" "صنف انشائیہ کے بارے میں پروفیسر جمیل آذر کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جو گزشتہ چالیس برس میں ان کے قلم سے نکلے ہیں اور اب اُردو میں صنف انشائیہ کی گولڈن جوبلی کے موقع پر شائع ہوئے ہیں۔ ساٹھ کی دہائی سے پہلے اردو میں انشائیہ کی پذیرائی اس درجہ نہیں تھی، جتنی کہ آج ہے۔ ۱۹۶۱ء میں جب وزیر آغا کے انشائیوں کا اولین مجموعہ شائع ہوا تو مولانا صلاح الدین احمد، مدیر "ادبی دنیا" نے لکھا:

> "مجھے اس بات کا یقین ہے کہ اس صنف نے ادب کی اس نئی پگڈنڈی پر جو چراغ روشن کیا ہے، اس کی جھلملاتی ہوئی روشنی میں ہمارے نئے لکھنے والے اور آگے بڑھیں گے اور تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اپنے اپنے چراغ اسی طرح رکھتے چلے جائیں گے۔"

یہ پیش گوئی حرف بہ حرف درست ثابت ہوئی، آج اس راستے میں اتنے چراغ روشن ہیں کہ اس رہگذار پر راہ کا کہکشاں کا گمان ہوتا ہے۔ پروفیسر جمیل آذر ہمارے ان اولین انشائیہ نگاروں میں شامل ہیں۔ جنھوں نے اپنی تحریروں، روشن فکری اور مسلسل کاوش سے اس صنف کو معتوی بنانے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ پرانے مفروضات جن کو بتوں کا تقدس حاصل تھا۔ انہوں نے پاش پاش کیا، اس اعتبار سے ان کا نام "جمیل آذر" کی بجائے "جمیل ابراہیم" ہونا چاہئے تھا مگر ایک لحاظ سے "آذر" بھی ان کے نام کا حصہ کچھ ٹھیک ہی ہے، کیونکہ انہوں نے اردو میں ایک نیا بت ضرور تراشا، جس کا نام "انشائیہ" ہے، انہوں نے اس بت کو ادب کے معبد میں ایک بلند مقام پر، دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر ایستادہ بھی کیا، ان لوگوں میں پہلا نام ڈاکٹر وزیر آغا کا ہے، دوسرے ناموں میں مشتاق قمر کا نام لیا جاسکتا ہے۔ اس خاص مزاج کے نثر پارے کے لئے "انشائیہ" کا نام بھی وزیر آغا ہی نے تجویز کیا۔ مولانا صلاح الدین احمد نے اس خاص قسم کی تحریر کو مضمون یا پارۂ انشا کا نام دیا تھا مگر مولانا کو اس امر کا احساس ضرور تھا کہ "انشائیہ" اردو میں ایک جدید ترین صنف ادب ہے۔ انشائیہ کے اجزاء یوں تو روایتی طور پر بکھری ہوئی صورت میں بعض پرانے لکھنے والوں کے یہاں بھی مل جاتے ہیں مگر خالص انشائیہ کی تحریر کو ڈاکٹر وزیر آغا نے جس طرح اپنے ادبی مجلّہ "اوراق" (اجراء ۱۹۶۶ء) کے

ذریعہ آگے بڑھایا' اُس کی نظیر اس سے پہلے نظر نہیں آتی۔

جمیل آذر کی زیرِ نظر کتاب میں شامل مضامین چونکہ ایک طویل مدت کے دوران لکھے گئے اس لیے اس میں بہ اعتبار موضوع خاصا تنوع موجود ہے۔ مضامین میں چار ابتدائی مضامین' صنف انشائیہ کے مختلف پہلوؤں پر' اصولی بحث سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک مضمون اُردو میں صنف انشائیہ کی پچاس سالہ روداد ہے۔ یہ مضمون اس لحاظ سے اہم ہے کہ بیک نظر' اردو انشائیہ کے شعر کی تمام روشن منازل ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔ آخری دو مضامین کے علاوہ جن میں مصنف کے دوستوں نے ان کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ سترہ مضامین عملی تنقید و تبصرہ کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان مضامین میں فاضل مصنف نے کسی انشائیہ نگار کی ادبی خدمات یا پھر اس کے انشائیوں کے کسی مجموعے پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ اس کتاب کی اہمیت ہمارے نزدیک اس وجہ سے بھی ہے کہ صرف یہی ایک کتاب دیکھ کر' اردو ادب کی اہم صنف ''انشائیہ'' کے بارے میں وہ سب کچھ پتہ چل جاتا ہے جو اردو ادب کے کسی قاری یا طالب علم کے لیے جاننا ضروری ہے۔

نام کتاب : تاروں بھرا آسماں

مرتبہ : ثاقبہ رحیم الدین

طابع : پیپ بورڈ پرنٹرز' راولپنڈی

ضخامت : ۸۰۲ صفحات

قیمت : ۶۰۰ روپے

''تاروں بھرا آسماں'' نامور ادیبہ ثاقبہ رحیم الدین کی شخصیت اور تصانیف سے متعلق' مختلف اہل الرائے کی تحریروں کا مجموعہ ہے جو اسی برس شائع ہوا ہے۔ اس سے قبل اسی نوعیت کی ایک اور تالیف ۱۹۹۲ء میں سید عابد رضوی نے ''ممتا ہی ممتا'' کے نام سے مرتب کی تھی جس میں محترمہ ثاقبہ رحیم الدین کے قلم سے لکھی ہوئی' تقریباً ایک درجن کتب پر اظہار خیال کرنے والوں کی تحریروں کی تلخیص اور اس کے ساتھ ہی مصنفہ کی گزشتہ ادبی زندگی کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے ''تاروں بھرا آسمان'' کو اسی سلسلہ کی ایک کڑی اور گزشتہ نقش کا فی الحال تکملہ تصور کرنا چاہئے۔ فی الحال اس لیے کہ ہم جانتے ہیں کہ ان کی دو کتابیں ''دل کی باتیں''

اور ''نیند آئی'' جلد ہی چھپ کر منظرِ عام پر آنے والی ہیں۔ یوں ان کی شخصیت اور فکر کے بارے میں یہ مکالمہ ابھی اور آگے بڑھے گا۔

''تاروں بھرا آسماں'' میں شامل تحریروں کو ہم اپنی سہولت کے لیے دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا حصہ تصانیف اور دوسرا حصہ شخصیات سے تعلق رکھتا ہے۔ تصانیف میں ثاقبہ رحیم الدین کے لکھے ہوئے دو افسانوی مجموعے ''محبت'' اور ''درد ہی درد'' اور ان کے لکھے ہوئے مضامین' انشائیے' مقالہ جات اور سنجیدہ و شگفتہ ادبی مضامین کے مجموعے ''تہذیب کے زخم'' اور ''محفلِ تنہائی'' کے بارے میں لکھی گئی تحریریں اور شخصیات کے حصہ میں مرتبہ کے والد گرامی ڈاکٹر محمود الحسن اور خود مصنفہ کے بارے میں مختلف اہلِ قلم کی نگارشات شامل ہیں۔

''تاروں بھرا آسمان'' میں شامل مضامین کا انداز یا تو توضیحی ہے یا پھر تحسین آمیز۔ وضاحت اور توصیف کے پہلو بہ پہلو اگر تجزیاتی انداز کو بھی وہ اہمیت دی جاتی جو اس کا حق تھا تو یہ تحریریں مدلل مداحی کے دائرہ سے نکل کر زیادہ متوازن ہو جاتیں۔

مرتبہ نے اس کتاب میں جس طرح بکھرے ہوئے مواد کو ایک خاص سلیقہ اور ترتیب سے یک جا کر دیا ہے وہ یقیناً قابلِ تحسین ہے۔ خصوصاً ہمارے اپنے حالات میں جہاں تحقیق کے میدان میں قدم رکھنے والوں کو فراہمیِ مواد کے لیے حد درجہ صبر آزما مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ مستقبل میں ثاقبہ رحیم الدین پر تحقیقی کام کرنے والے' اس کتاب اور ''ممتا ہی ممتا'' کی موجودگی میں' اُس ذہنی اور جسمانی اذیت سے بچ جائیں گے جو عام حالات میں ایسے لوگوں کو برداشت کرنی پڑتی ہے۔

ثاقبہ رحیم الدین ادبی اور سماجی طور پر حد درجہ فعال صاحبِ قلم خاتون ہیں۔ انہوں نے جہاں بڑے افراد کے لیے افسانے' انشائیے' مقالے' اور مضامین سپردِ قلم کیے ہیں' وہیں بچوں کے لیے بھی لگاتار کہانیاں لکھی ہیں۔ اب تک ان کے قلم سے کم و بیش چوبیس کتابیں' منصہ شہود پر آ چکی ہیں۔ ان میں وہ کتابیں بھی شامل ہیں جو انہوں نے مرتب کی ہیں۔ علاوہ ازیں وہ کئی ادبی رسائل کی مدیر اور نگران ہیں۔

ایک خصوصیت اس تالیف کی یہ بھی ہے کہ یہ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں کی تحریروں پر مشتمل ہے۔ انگریزی زبان میں لکھی گئی تحریریں کم و بیش وہی ہیں جو مختلف اخبارات میں بطور بک ریویو چھپ چکی ہیں۔ ثاقبہ رحیم الدین ایک حساس اور درد مند دل رکھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اپنی تحریر پڑھنے والے کے لیے ایک خاص کشش رکھتی ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے' بامعنی جملے لکھتی ہیں جو پڑھنے والے کے حواس کو براہ

راست متاثر کرتے ہیں۔ اس لیے "تاروں بھرا آسمان" میں لکھنے والوں کی اس کہکشاں کو دیکھ کر کسی قسم کی حیرت نہیں ہوتی۔ ان لکھنے والوں میں جہاں معروف و مستند اہل قلم مثلاً جمیل الدین عالی، احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر وزیر آغا، مرزا ادیب، شہزاد احمد، ڈاکٹر وحید قریشی، پروفیسر سحر انصاری، ڈاکٹر انور سدید، محسن احسان، پروفیسر فتح محمد ملک، افتخار عارف، عاصی کرنالی، کرنل غلام سرور شامل ہیں، جس سے اس تالیف کی قدر و منزلت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، وہیں نسبتاً غیر معروف نام بھی شامل ہیں، جن کے بارے میں خود ثاقبہ رحیم الدین اس کتاب کے انتساب میں لکھتی ہیں:

"ان قلم والوں کے نام جن کو اللہ کی رضا سے آج یا کل چمکنا ہے"

اس کا مطلب یہ ہے کہ آٹھ سو صفحات پر مشتمل یہ تالیف اس امر کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ ثاقبہ رحیم الدین کی شخصیت اور فن میں ایک بڑے حلقہ کو متاثر کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔

نام کتاب : الاہُو

شاعر : مشکور حسین یاد

ناشر : المعراج کمپنی، لاہور

ضخامت : ۱۹۶ صفحات

قیمت : ۱۵۰ روپے

"الاہُو" مشکور حسین یاد کی حمدیہ منظومات کا مجموعہ ہے جو اسی برس مئی میں شائع ہوا ہے۔ یاد صاحب ایک کثیر الجہات ادبی شخصیت کے مالک ہیں، وہ ایک معروف انشائیہ نگار، ادبی نقاد، شاعر اور ماہر غالبیات ہیں۔ اب یہ ان کا تازہ مجموعہ شعری ان کی شاعرانہ شخصیت کی ایک اور جہت کو سامنے لایا ہے۔ حمد اور انسان کا تعلق اور اس کے دل پر خدائے بزرگ و برتر کی عظمت و جلال اور اس کے حسن و کمال کا نقش قائم ہوا۔ مظاہر حیات کی پر تکلف تخلیق پر غور و فکر اور اس کے نتیجہ میں دل و دماغ پر ایک حیرت زا کیفیت کے عالم میں جو لفظ بھی زبان سے نکلے وہ ابتدا حمد ہی کے زمرہ میں آتے ہیں۔ دراصل شاہکار کی تعریف، مصور ہی کے کمال کی تعریف ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے نعت اور بزرگان دین کی منقبت بھی دراصل حمد ہی کی توسیع کی صورتیں ہیں۔

اُردو میں حمد کی روایت اتنی ہی قدیم ہے جتنی خود اردو شاعری، عربی اور فارسی کی روایت کے تتبع میں،

قدیم زمانے سے اُردو شاعر جب اپنا دیوان مرتب کرتے تو اس کی ابتداء حمد اور پھر اس کے بعد نعتیہ اشعار سے کرتے تھے۔ یہ روایت اتنی مستحکم تھی کہ غیر مسلم شعراء بھی اس کی پابندی ضروری سمجھتے تھے۔ شروع میں حمد و نعت محض اظہارِ عبدیت و عقیدت کی ایک صورت تھی' اس کا فنی مرتبہ اتنا بلند نہیں تھا جتنا کہ آج ہے۔ جستہ جستہ حمدیہ منظومات اور اشعار سے قطع نظر' اردو شاعروں نے حمد کے مستقل مجموعے بھی ترتیب دیئے ہیں۔ ان حمدیہ مجموعوں میں ''دیوان احمد ایزدی'' مصنفہ غلام سرور لاہوری' مطبوعہ ۱۸۸۱ء ... ''نذر خدا'' مصنفہ مضطر خیر آبادی' مطبوعہ ۱۹۱۲ء۔ ذوالجلال والاکرام' مصنفہ حافظ لدھیانوی' مطبوعہ ۱۹۸۶ء حافظ لدھیانوی ہی کے دو اور مجموعے ''سبحان اللہ والحمدہ'' اور ''سبحان اللہ العظیم'' ۱۹۹۰ء میں شائع ہوئے۔ ۱۹۹۰ء ہی میں کاوش زیدی نے اپنا حمدیہ کلام ''بحضور حق تعالیٰ'' کے نام سے شائع کیا۔ ''حمدیہ قطعات'' پر مشتمل' مسرور بدایونی کا مجموعہ کلام ۱۴۱۵ھ میں شائع ہوا (یہ فہرست مکمل نہیں) پاکستان چونکہ ایک ایسی نظریاتی مملکت ہے جس کی اساس توحید اور رسالت کے روشن عقیدے پر ہے' اس لیے یہاں جس تواتر سے' حمد اور نعت لکھی گئی اور ان کے مجموعے شائع ہوئے' اس کی نظیر برصغیر کے دوسرے علاقوں میں لکھی جانے والی شاعری میں نہیں ملتی۔

اردو میں حمد کے مرتبہ مجموعوں کے مقابلہ میں' مشکور حسین یاد کی زیر نظر کاوش کو کئی اعتبار سے امتیاز حاصل ہے۔ حمد و نعت چونکہ ایک مستقل موضوع ہے' اس لیے یہ کسی بھی ہیئت میں مکمل کی جا سکتی ہے۔ بیشتر صورتوں میں اگرچہ شاعروں نے غزل ہی کی ہیئت کو ترجیح دی ہے۔ یاؔد نے نہ صرف غزل کی ہیئت میں حمدیں لکھیں بلکہ اس کے لیے نظم آزاد' نظم معریٰ' نظم مُعرّیٰ اور گیت کی اصناف سے بھی کام لیا ہے۔ غزل کی ہیئت میں لکھی جانے والی حمدیں تعداد میں سب سے زیادہ ہیں' یعنی چھیاسٹھ۔ دوسری امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ مشکور حسین یاد نے یہ بھی التزام کیا ہے کہ ہر حمد کے لیے کسی آیہ کریمہ یا معنوی طور پر اس کے کسی خود کفیل ٹکڑے کو اس کا عنوان بنایا ہے۔ یاؔد کہتے ہیں کہ انہوں نے حمد پہلے لکھی اور بعد میں اس کے لیے مناسب آیت قرآنی کی تلاش کی گئی۔ لیکن دوران مطالعہ احساس ہوا کہ بیشتر صورتوں میں ایسا نہیں کیا گیا ہے۔ زیب عنوان' آیہ رحمانی کی مناسبت سے شاعر نے ردیف کا انتخاب کیا' مثلاً سورہ یونس' آیت ۲۔ ''اور اہل ایمان کو خوشخبری دو کہ اللہ کے حضور ان کے قدم مضبوط ہیں''۔ اس حمد کی ردیف ''ثبات قدم'' اختیار کی گئی ہے۔ اسی طرح سورہ حدید' آیت ۹۔ ''وہی تو ہے جو اپنے بندے پر واضح المطالب آیات نازل کرتا ہے'' اس حمد کی ردیف ''نزول'' ہے۔ بیشتر حمدیہ غزلوں میں بھی یہی صورت دکھائی دیتی ہے۔

اس التزام سے انحراف کی صورتیں بھی دیکھنے میں آئیں۔ مثلاً ایک ہی آیہ کریمہ کے تحت ایک سے زیادہ حمدیں لکھی گئی ہیں' مثلاً ص ۵۸ پر' ص ۱۸۹ پر تعلیقات کی آیہ قرآنی ایک ہی ہے۔ ایک اور صورت جو دیکھنے میں آئی' وہ یہ ہے کہ ایک ہی نظم کو دو مختلف آیات کریمہ کے تحت مختلف صفحات پر درج کر دیا گیا ہے۔ (دیکھیے) ص ۱۹۵ اور ص ۱۸۲' یہ صورتحال بہرحال نہیں ہونی چاہیے تھی۔

آیہ کریمہ کی مناسبت سے حمد کے لیے ردیف اختیار کرنے کا ایک فائدہ بھی ہوا ہے اور وہ یہ کہ غزل کی پریشان خیالی میں ایک داخلی معنوی ربط خود بخود پیدا ہو گیا ہے۔ یوں ان حمدوں میں غزل اور نظم گلے ملتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ سورہ یونس' آیت ۶۲: ''سنو کہ خدا کے دوست نہ ڈرتے ہیں اور نہ غمگین ہوتے ہیں'' اس عنوان کے تحت حمد کے یہ شعر دیکھیے:

جن کے دلوں میں طمن اجالے' ان پر کوئی خوف نہ حزن   جو ہیں تیرے چاہنے والے' ان پر کوئی خوف' نہ حزن
جو ہر حال میں تجھ کو پکاریں خود کو سنواریں سچ کے سنگ   وہ تیری رحمت کے پالے' ان پر کوئی خوف نہ حزن

مشکور حسین یاد کی ان حمدوں پر جو غزل کی ہیئت میں مکمل کی گئی ہیں' ان کی عام غزلوں کا پرتو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ جس قسم کی منفرد ردیفیں اور نادر قوافی اپنی غزلوں کے لیے منتخب کرتے ہیں' ان کی یہ حمدیں بھی اس وصف سے خالی نہیں۔ کچھ کہہ کر' کچھ نہ کہنے کا انداز اور بہت کچھ قاری پر چھوڑ دینے کی روش' ان کی غزلوں کی طرح' ان کی ان حمدوں میں بھی موجود ہے۔

یہ حمدیں' مشکور حسین یاد نے بیشتر یورپ کے سیر و سفر کے دوران لکھیں۔ وہاں کے برہنہ پن کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

> ''چنانچہ میں نے ان تمام قباحتوں کو بھی اپنی نہایت کمزور ذات پر برداشت کیا اور اللہ کی حمد بھی کرتا رہا۔ ممکن ہے ان قباحتوں کا اثر میری حمد پر بھی پڑا ہو' اسی لیے میں نے یورپ کے ان شہروں کا حوالہ اپنی اس مختصری کتاب میں دے دیا ہے' تاکہ آپ مجھے رنگے ہاتھوں پکڑ سکیں۔''

لیکن ہمیں ان منظومات میں وہاں کی مخصوص برہنہ معاشرت کا کوئی عکس اور کوئی اشارہ کہیں نظر نہیں آیا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ حمدیں لکھ کر شاعر نے رد بلا کے لیے ایک نورانی حصار اپنے گرد کھینچ لیا تھا۔

نام کتاب : رودِ خیال
شاعر : خیال آفاقی
ناشر : مکتبہ المصیرہ، کراچی
ضخامت : ۲۲۳ صفحات
قیمت : ۳۰۰ روپے

''رودِ خیال'' خیال آفاقی کا پانچواں مجموعہ کلام ہے، جس کا نام ان کے تخلص کی مناسبت سے رکھا گیا ہے۔ اس سے پہلے ''شب نامہ'' آب دیدہ، خواب دیدہ اور ''مری آواز مکے اور مدینے'' ان کے شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ناول، ٹی وی ڈرامے اور ادبی مضامین ان کے علاوہ ہیں۔ یہ تفصیل ان کی ہمہ گیر ادبی شخصیت کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ زیرِ نظر مجموعہ بھی بڑا بھرپور ہے، جس میں غزلوں کی تعداد سو سے اوپر اور نظمیں پچاس کے لگ بھگ ہیں۔ قطعات اور متفرق اشعار ان کے علاوہ ہیں۔ کلام کی یہ مقدار اتنی زیادہ ہے کہ اس سے باآسانی دو معقول مجموعے مرتب کیے جا سکتے تھے، جیسے کہ عام طور پر ان دنوں چھپ رہے ہیں مگر ''رودِ خیال'' کا یہ توانا رخ، ہمارے خیال میں اس کا کمزور پہلو بھی ہے۔ جس طرح لکھنے والے کی ایک شخصیت ہوتی ہے، اسی طرح ایک کتاب کی شخصیت بھی ضروری ہے۔ ''رودِ خیال'' کی غزلوں اور نظموں میں قدیم و جدید اور روایت و تجربہ دونوں بیک وقت موجود ہیں۔ عموماً یہ متضاد و متخالف عناصر گھل مل کر ایک نہیں ہوئے۔ بلکہ الگ الگ رہتے ہیں۔ ان نگارشات کی ''رودِ خیال'' میں شمولیت سے کتاب کی ضخامت میں ضرور اضافہ ہوا ہے، مگر اس سے شاعر کے قد و قامت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس مجموعہ میں دو قسم کی غزلیں پہلو بہ پہلو موجود ہیں، ایسی غزلیں بھی جو روایت کی بازگشت کے سوا کچھ اور نہیں۔ یہ غزلیں کہتے ہوئے شاعر بے تکان، گفتنہ مضامین ایک ایسے اسلوب میں بیان کرتا چلا جاتا ہے جس میں تازگی کی کمی کا شدید احساس ہوتا ہے۔ ایسے شعروں میں تراکیب بھی وہی ہیں جو کثرتِ استعمال سے اپنی دلکشی کھو چکی ہیں، یہ شعر دیکھئے:

کسی کو کیا بتائیں ہم کہ یہ سوز نہاں کیا ہے سراسر آتش سیال ہے، اشک رواں کیا ہے
ابھی رو کر چکا ہوں، زحمت پرسش نہ کر ہمدم یہی دو اشک ہیں اپنے جنوں کی داستاں کیا ہے
ہر اک پل موت ہے جیسے ہر اک لحظہ قیامت ہے ہمارے واسطے یہ ایک مرگ ناگہاں کیا ہے

"سوزِ نہاں" "اشکِ رواں" "آتشِ سیال" "پرسش" اور "مرگِ ناگہاں" وہ ڈھیلی ڈھلائی ترکیب ہیں جو سالہا سال سے غزل میں برتی جارہی ہیں۔ خیال آفاقی کا شعری وجدان اور ان کی ہنرمندی کا اظہار ان کی ان غزلوں میں ہوا ہے جو جدید طرزِ احساس کی حامل اور خیال و اسلوب کے لحاظ سے تازگی لیے ہوئے ہیں۔

سنبھال اپنے مہ و آفتاب اے دنیا　　وہ خاک ہی سہی میرا چراغ مجھ کو دے

ہے آج بھی مرے دامن میں جگنوؤں کا ہجوم　　سحر کسی کو شب بے چراغ مجھ کو دے

چلا ہی تھا میں اسے ڈھونڈنے کو رستے میں　　ہوا نے مجھ سے کہا: لا چراغ مجھ کو دے

گل پہ تتلی بادلوں میں چاند چھپتا دیکھ کر　　آج بھی بچہ سا بن جاتا ہوں تارا دیکھ کر

عکس مفقود، آئینہ موجود　　اور کوئی چیز درمیاں بھی نہیں

کبھی کبھی تو بہت یاد آنے لگتے ہیں　　کھلونے ٹوٹ گئے تھے جو ہم سے بچپن میں

ساحل ساحل چلنے والو، یاد رہے　　پاؤں تلے کی ریت بھی تو بہہ جاتی ہے

خیال آفاقی کی یہ غزلیں اپنی الگ فضا اور اپنی الگ پہچان رکھتی ہیں۔ جہاں ان کے مزاج کی نفاست، غزل کے شعروں میں در آئی ہے، غزل کے شعروں پر گیت کا گمان ہونے لگتا ہے۔ خیال آفاقی کی شخصیت کی تشکیل میں چونکہ متصوفانہ ماحول کا عمل دخل بھی رہا ہے۔ ان کی بعض غزلوں کا لب و لہجہ اس قدر جداگانہ اور منفرد ہے کہ ان کو دوسری غزلوں سے الگ پہچانا جاسکتا ہے۔

ہاتھوں میں اکتارا، لب پر اللہ ہو　　جگ میں گھوموں جوگی بن کر اللہ ہو

سر پر سورج، موم کی گڑیا جنگل میں　　دور بہت ہے میلے سے گھر اللہ ہو☆

تو پھر تو ہے، تیرے عاشق لوگوں کا　　کیا کہنا، اللہ اکبر، اللہ ہو

اردو نظم اپنے ارتقائی فنی سفر میں مختلف مراحل سے گذری ہے۔ ابتداء میں ہمارے یہاں نظم روایتی اصنافِ سخن کی مروجہ ہیئتوں کی پابند تھی۔ اقبال نے ان حدود کو کس قدر شکست کرنے کی سعی کی۔ جوش اور مجاز کے دور تک نظم کا وہ تصور عام نہیں ہوا تھا، جس میں تاثراتی اکائی کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے، مجاز کی مشہور

☆ یہ شعر احسان دانش مرحوم کے درج ذیل شعر کی یاد تازہ کر دیتا ہے:

کچھ دھوپ کے میلے سے خریدے تھے کھلونے　　جو موم کا پتلا تھا وہ گھر تک نہیں پہنچا (ادارہ)

نظم ''آوارہ'' ہے جس کو شاعر نے مختلف بندوں میں تقسیم کیا ہے ہر بند کے بعد شاعر:

اے غم دل کیا کروں' اے وحشت دل کیا کروں

دہراتا ہے۔ نظم کے تمام بند مل کر ایک تاثر پیدا نہیں کرتے بلکہ ہر بند پہلے تاثر کا اعادہ کرتا چلا جاتا ہے۔ نظم تاثر کے لحاظ سے ایک دائرہ میں گردش کرتی رہتی ہے۔ اس نظم میں سے کوئی بند کم کردیں یا دو بند اپنی طرف سے تصنیف کرکے نظم میں شامل کردیں' نظم کے تاثر میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوگی۔ لیکن جدید نظم میں اگر ایک سطر بھی کم کر سکیں اور اس کے تاثر میں کمی واقع نہ ہو تو فنی لحاظ سے یہ اس نظم کی خامی ہوگی۔ ''رودِ خیال'' میں دونوں قسم کی نظمیں موجود ہیں۔ پہلی قسم کی نظموں میں ''دلوں کے دکھ'' میں کتنا خوبصورت ہوں'' اور ''ارضِ وطن'' کے نام لیے جاسکتے ہیں اور دوسری قسم کی نظموں میں ''تو ہی تو'' ''پکار'' ''انتظار کے سائے'' وغیرہ شامل ہیں۔ آخر الذکر نظموں ہی سے' آج کے دور میں' خیال آفاقی کی بحیثیت ایک نظم گو قدوقامت کا تعین کیا جاسکتا ہے۔

خیال آفاقی کا تمثیل پسند ذہن جب ان کی نظموں اور غزلوں پر عکس فگن ہوتا ہے تو اعلیٰ درجے کے شعری نمونے سامنے آتے ہیں۔ یہاں بے جان چیزیں چلتے پھرتے کرداروں میں بدل جاتی ہیں ڈرامائی تحرک جب شعر کے قالب میں ڈھل جاتا ہے تو مصرع پڑھتے ہوئے یوں لگتا ہے جیسے ہم کوئی تمثیل دیکھ رہے ہیں۔ نظم اُجرت نظم کم اور تمثیل زیادہ ہے۔

نام کتاب : وفا آواز دیتی ہے

شاعر : اکرم تبسم

ناشر : دستاویز مطبوعات، لاہور

ضخامت : ۱۲۸ صفحات

قیمت : ۱۰۰ روپے

''وفا آواز دیتی ہے۔ اکرام تبسم کا چوتھا شعری مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے، اُن کے تین (۳) مجموعہ ہائے کلام ''دکھ کا جزیرہ'' (۱۹۹۲ء) ''محبت کا مسافر (۱۹۹۹ء) ''خیال وملال'' (۲۰۰۰ء) شائع ہو چکے ہیں۔ شیخ علی حزیں نے کہا تھا ''تصوف برائے شعر گفتن خوب است'' اس قول میں اگر ''تصوف'' کی جگہ ''عشق'' کہہ لیا جائے تو بھی کوئی قباحت نہیں، کیونکہ ''تصوف'' بھی تو اپنی نوعیت کے لحاظ سے عشق ہی کی ایک صورت

ہے۔ اس ردو بدل سے ایک فائدہ ضرور ہوگا۔ وہ یہ کہ ہمارے لیے، اکرام تبسم کی شاعری کی تفہیم آسان ہو جائے گی۔ اکرام تبسم تجارت پیشہ ہی نہیں، عشق پیشہ بھی ہیں۔ یہ عشق ہر جائی قسم کا نہیں بلکہ وفاداری بہ شرط استواری کا قائل نظر آتا ہے۔ یوں نہ ہوتا تو وہ اپنے شعری مجموعے کا نام "وفا آواز دیتی ہے" کبھی نہ رکھتے۔ عشق اختیار کرنے میں کوئی خرابی نہیں، بس آدمی کو مجنوں نہیں بننا چاہیے۔ تکریم وفا، اور ناموس محبوب دونوں کی پاسداری ضروری ہے، ورنہ محبت کرنے والے کا حال، میرؔ سے مختلف نہیں ہوتا:

"ادھر آبے ابے او چاک گریباں والے" یوں پکاریں ہیں مجھے کوچہ جاناں والے

اس مجموعۂ کلام ہیں، کیا نظم اور کیا نثر دونوں جگہ، واضح طور پر بین السطور ایک محبوب ہستی کا نام لیا گیا ہے اور محبت کا اظہار کیا گیا ہے یوں نہ ہوتا تو بہتر تھا۔ ہم نے قصداً وہ شعر اور وہ فقرے یہاں نقل نہیں کیے کیونکہ ہم کو شاعر سے زیادہ اس کی محبوبہ کی عزت کا خیال دامن گیر ہے۔

اکرام تبسم کے یہاں عشق اور اس سے پیدا ہونے والے حالات و کیفیات محض خیالی نہیں بلکہ ان کا ان کی زندگی سے گہرا تعلق ہے:۔

جذبوں کی برسات کرو — پاس آؤ، کچھ بات کرو

اپنی سانسوں سے زندہ — میرے احساسات کرو

حسن بکھیرو، جادو سا — نظروں سے خیرات کرو

اپنی زلفیں بکھراؤ — آؤ، دن کو رات کرو

محبت کرنا، اکرام تبسم کی زندگی ہے۔ اگرچہ اس محبت کا دائرہ ہمیشہ اس کی ذات تک محدود نہیں رہا بلکہ وسیع تناظر میں یہ جذبہ، اس کی اپنی سرزمین سے محبت اور پھر اس سے بھی بڑھ کر تمام انسانوں کی محبت میں ڈھل گیا ہے انسانی معاشرہ میں پائی جانے والی ناہمواریاں، منافقانہ رویے اور ایثار کے برخلاف خودغرضی اور لالچ سے پیدا ہونے والی المناک صورتیں اس کو اپنی طرف متوجہ کیے بغیر نہیں رہتیں۔

مراسلات

اویس جعفری۔ سیاٹل (امریکہ)

میرے لئے الاقربا ایک خوبصورت دریچہ ہے۔ جو ادب عالیہ کی سمت کھلتا ہے۔ مقناطیسی نام، دیدہ زیب پیرہن، مناسب سائز، ہر اداریہ اہم اور وسیع تر موضوعات کو احاطہ کے کوزہ ایجاز میں جامعیت کا شاہکار اور زبان و بیان کا فن پارہ ہے۔ جو منتخب "قلم کشان ادب" "انجمن الاقرباء" کی زینت ہیں ان میں کچھ سے یہاں مشاعروں میں ملاقات ہوئی ہے کچھ سے پرانی یاد اللہ ہے، کچھ کی تصاویر سے آشنا ہوں اور کچھ کی تخلیق کے توسط سے شرف تعارف کے خوش آئند تجربہ سے گزر رہا ہوں۔ خیال افروز علمی و تحقیقی مضامین، عقیدت سے لبریز دلگداز حمدیہ نظمیں، عشق و عقیدت سے بھرپور پر کیف وجد آفریں نعتیں، لطیف گنگناتی ہوئی غزلیں، سبک اور اچھوتی نظمیں، دلچسپ افسانے، نئی مطبوعات پر معلوماتی تبصرے ہے۔ وطن عزیز کے تاریخی و تفریحی مقامات کی الفاظ میں تصویر کشی جو صرف نوید ظفر صاحب کا حصہ ہے بیگم طیبہ آفتاب کے گھریلو چٹکلے، غرض "ہر رنگ کے ساغر ہیں ہر کیف کی بادہ ہے" ایک گنجینۂ ادب ہے جو شوق مطالعہ کو مستقل مہمیز دیتا ہے۔ اللہ آپ کو، رفیقان کار اور اس مجلہ کی انجمن کو رحمت و برکت سے نوازے، "سیکڑوں کے سر پہ یا رب ہو پیر میکدہ ہے"۔

علامہ قابل مرحوم سے پہلے پہل خلیل بھائی کے یہاں لاہور میں نیاز حاصل ہوا تھا۔ اور اس کے بعد راولپنڈی / اسلام آباد میں چند بار مرحوم نے شرف ملاقات بخشا۔ وجیہ وضعدار اور بارعب شخصیت کے حامل تھے۔ اقلیم سخن میں بھی وہ اپنی شمشاد قامتی برقرار رکھتے ہیں، اس کا اندازہ الاقربا کے صفحات سے ہوا۔ کیا خوب اشعار ہیں:

قیامت پیش رو یس رکھدی محبت درمیاں رکھدی — بنائے ظرف دل خلاق عالم نے کہاں رکھدی

خورشید سے وہ آنکھ ملائے تو کیا عجب — دیکھا ہے چاند نے رخ انور حضور ﷺ کا

ضرور عرش بریں کی طرف ہے کوئی رواں — فصیل کاہکشاں پر جو جل رہے ہیں چراغ

افسوس مرحوم کا بیشتر کلام تلف ہو گیا جو کچھ آپ کی سعی سے ہاتھ آیا ہے وہ مرحوم کو صف اساتذہ میں نمایاں مقام عطا کرتا ہے۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم — تو نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کیے

وہ شیشہ گران الاقربا جو اپنے مضامین کو فارسی اشعار کے دلکش نگینوں سے مرصع کرتے ہیں قابل ستائش ہیں کہ انہیں اپنے قارئین سے فارسی کے سلسلہ میں خوش گمانی ہے۔ دیار مغرب کے باسیوں اور بطور خاص نئی

نسل کو فارسی کی اتنی مدد پڑ نہیں ہے۔ ڈاکٹر معز الدین صاحب کو تعظیم وسلام پہنچے کہ انہوں نے اپنے مضمون (اپریل۔ جون ۲۰۰۴ء، صفحہ ۱۵) میں اردو ترجمہ کا اہتمام فرمایا ہے، دوسرے مضمون نگار بھی اگر یہ تکلیف گوارا کریں تو جہاں فارسی جیسی شیریں زبان سے تجدید ربط ہو گا وہاں مضمون کا لطف بھی دوبالا ہو جائے گا اور راہ دان شوق "رود بہس" کے شاکی نہیں ہو سکتے۔ اگر صاحب مضمون کے لئے یہ ممکن نہ ہو تو یہ ذمہ داری مجلس ادارت کو سونپ دیجئے۔ مجھے یقین ہے۔ کہ اکثر قارئین آپ کے تعاون کو تحسین کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ اللہ الاقربا کے پروف ریڈر کی چشم عقاب آسا کے شوق شکار کو فزوں تر فرمائے۔ آمین!

آپ نے اپنے تازہ ترین اداریہ میں (جولائی۔ ستمبر ۲۰۰۴ء) جس کاروبار شاعرگری کی طرف اشارہ کیا ہے، امریکہ اس کی لپیٹ میں ہے۔ یقین نہیں آتا کہ معتبر شعراء علم وفن کی سوداگری میں ملوث اور متشاعروں کی پرورش بھی کر سکتے ہیں:

"عجب ہنر ہے کہ دانشوری کے پیکر ہیں کسی کا ذہن کسی کی زباں لئے پھریئے"

الاقربا کی "بزم وفا" میں محاسن کلام کا۔ ابھی جستہ جستہ مطالعہ کر رہا ہوں۔ "ہندوستان کی دوسری الہامی کتاب" میں جناب شوکت واسطی صاحب کا کیسا اچھوتا اسلوب ہے، محبوب واسطی صاحب نے لفظ "الاقربا" کی کیا خوب نقاب کشائی فرمائی ہے۔ حکیم سرو سہارنپوری کی سلیس نظم "تقسیم کار" کیسی پُرکار ہے۔ جناب پروفیسر عاصی کرنالی (آپ کو ہر صنف ادب پر دسترس حاصل ہے) نے تازہ ترین شمارہ میں الفاظ کے انتخاب اور دروبست سے حمد میں کیسی موسیقی اور وجد آگیں نغمگی پیدا کی ہے۔

ایک خط جناب حبیب اللہ اوج کا نظر سے گزرا اور ان سے لاہور میں ملاقاتوں کی یاد تازہ کر گیا۔ کیسی خلیق، وضعدار اور عظیم شخصیت کے حامل ہیں۔ اپنے ایک عزیز سے جب ملنے تشریف لاتے تو مجھے بھی شرف دیدار عطا کرتے، ایک دن میں نہیں تھا میری میز پر یہ شعر لکھ کر چھوڑ گئے:

آرزوئے دید جاناں بزم میں لائی مجھے بزم سے میں آرزوئے دید جاناں لے چلا

آج بھی انکی تحریر میرے ادبی سرمایہ کا حصہ ہے۔

سید مرتضیٰ موسوی۔ اسلام آباد

سہ ماہی "الاقربا" کا جولائی ۔۔ ستمبر ۲۰۰۴ء کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ میری کوشش ہے کہ فارسی کے ادب عالیہ کے ساتھ ساتھ معاصر ادب کے مختلف گوشوں کو آپ کے موقر مجلے کے ذریعے محترم قارئین تک پہنچاؤں۔ اگلے

شمارے کے لئے مقالہ "بیسویں صدی میں ایران اور برصغیر کی فارسی شاعری: ایک جائزہ" پیشِ خدمت ہے۔

حافظ شناسی کے مقالے کے حاشیے میں آپ نے "قدر" کے متحرک استعمال کے بارے میں قارئین کی توجہ مبذول کی ہے۔ حافظ کے ہاں دوسری غزلوں میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ صرف ایک شعر ملاحظہ ہو:

کس ندانست کہ منزلگہِ معشوق کجاست؟ این قدر ہست کہ بانگِ جرسی می آید۔

میں نے حافظ شناسی کے مضمون میں جن معتبر کتابوں سے استفادہ کیا ہے ان کے نام ۱۹ حواشی اور ۱۸ منابع و مآخذ میں پوری تفصیل کے ساتھ درج کر دیئے ہیں۔ حافظ کے دیوان کی برصغیر میں لکھی جانے والی پہلی شرح کے فاضل مضمون نگار نے ۴۲ صفحوں پر مشتمل مقالے میں اپنے بنیادی موضوع کو شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے جبکہ برصغیر میں حافظ شناسی پر ۱۰ صفحے کا مضمون، مطالعات و نفوذ حافظ کے سات سو سال پر محیط ہے۔ راقم نے جن منابع سے استفادہ کیا ہے، ان کے بڑی حد تک اشتراک سے یہ اشتباہ پیدا ہوا ہے۔ اس خاکسار نے ساٹھ کے دہائی سے اب تک فارسی میں سینکڑوں مضامین شائع کرنے کے علاوہ معتبر فارسی رسائل کی ادارت کی ہے جن میں پاکستان (تہران)، ہلال (کراچی)، پاکستان مصور (اسلام آباد) اور اب بھی بین الاقوامی نوعیت کے مجلّے کی ادارت میرے ذمے ہے۔ مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ پاکستان میں فارسی زبان و ادب کی طرف سے جو غفلت برتی جا رہی ہے اس کے پیشِ نظر ہمارے فارسی دوست حلقوں کو "الاقرباء" کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ تقریباً ہر شمارے میں ۲ یا ۳ مضامین فارسی سے براہ راست یا بالواسطہ متعلق شائع کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ کسی قسم کی بے جا تنقید سے اجتناب ضروری ہے۔ بہتر ہوگا کہ افادۂ عام کے لئے مذکورہ فارسی مضمون کا اردو ترجمہ خود مکتوب ☆ نگار کر دیں اور رسالے میں شائع فرمایا جائے۔

پروفیسر منظر ایوبی۔ کراچی

شرمندہ ہوں اور معذرت خواہ بھی۔ منظر سے غائب ہونے کا سبب خانگی مصروفیات تھیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ادبی کاموں کی تکمیل کے لئے باقاعدہ ایک شیڈول مرتب کیا تھا۔۔۔ یہ سمجھ کر کہ فرصت ہی فرصت ہوگی، مگر گزشتہ دس بارہ برس کے دوران شب و روز کی مصروفیات نے تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا ہے۔ یہاں تک کہ بعض ذمہ داریوں میں اضافہ ہو گیا ہے۔ ایسی صورت میں (ہم لاکھ دعویٰ کریں) ادبی امور جزوی طور پر ہی انجام پا سکتے ہیں، جبکہ ادب کی تخلیق "کل وقت" کی متقاضی ہے۔

☆ جناب ناصر نسیم آسی جن کا مراسلہ سہ ماہی "الاقرباء" بابت جولائی۔ ستمبر ۲۰۰۴ء (ص ۱۲۷۔۱۴۳) میں شائع ہوا۔ (ادارہ)

اسلام آباد میں خیر سگالی وفد کی بھارت روانگی کے وقت آپ سے فون پر مختصر گفتگو ہو سکی' دراصل اس وقت آپ اپنے نئے بنگلے کی تزئین و آرائش میں مصروف تھے' ہم نے آپ کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

ڈیڑھ ماہ کے بعد بھارت سے واپسی ہوئی۔ غیر حاضری کے دوران وصول شدہ خطوط' رسائل و جرائد اور ان سے وابستہ احباب کے تقاضے پورے کرنے کے بعد پہلی فرصت میں آپ سے مخاطب ہوں۔

گزشتہ پندرہ روز سے صرف "الاقرباء" ہی کے پانچ شمارے مرکز نگاہ بنے رہے ہیں۔ سردست ہر شمارے پر اظہار رائے ممکن نہیں۔ مجموعی طور پر صرف اتنا عرض کروں گا کہ آپ کے رفقاء اور آپ نے مختصر مدت میں "الاقرباء" کو سنوارنے اور نکھارنے میں کوئی دقیقہ فروگزشت نہیں کیا۔ نتیجہ یہ کہ اردو کے عالمی حلقوں میں اب یہ مجلّہ اپنی شناخت قائم کر چکا ہے۔ ادبی کساد بازاری کے اس دور میں یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ علاوہ ازیں مضامین' نظم و نثر کی رنگارنگی اور بوقلمونی اپنی جگہ' آپ کے "کاٹ دار" (کیٹیلے) اور نہایت موثر مبنی بر حقیقت اداریوں نے بھی مجلّے کی مقبولیت میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ خامہ ءعاقل پر امیرؔ کا یہ مصرع صادق آتا ہے۔

"کاٹ ہے اس آئینے میں تیغ جوہر دار کا"

فنکاروں کے حوالے سے وقت کے اہم سوالوں کو جنم دے رہے ہیں آپ! جو یقیناً قارئین کرام کے ذہنوں کو جلا' سوچوں کو ردا اور ہونٹوں کو نوا سنجی پر مجبور کریں گے۔

یوں تو جملہ قلمی معاونین کی تخلیقات قابل صد تحسین اور اعلیٰ اقدار کی آئینہ دار ہیں۔ مگر میری طرف سے محمد شفیع عارف دہلوی کو مبارکباد پیش کیجئے گا کہ انہوں نے دو بزرگان دین سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاءؒ اور حضرت ابوالحسن امیر خسروؒ پر مفصل معلوماتی تسلی بخش اور تحقیقی مضامین تحریر کر کے مذہبی و دینی موضوعات پر مشتمل لٹریچر میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ اس نوع کی تحریریں "الاقرباء" کی سرکولیشن اور مقبولیت میں مزید اضافہ کا سبب بنیں گی۔ محمد شفیع عارف دہلوی سے "بندگان حق" اور "مردان خدا" پر مزید مضامین لکھوایئے۔

اور! جس نکتہ خاص کی جانب آپ کی توجہ مبذول کرانے کی غرض سے نوشتہ ہذا احاطہ تحریر میں لانا ضروری سمجھا تھا' کہیں وہ ہی نہ رہ جائے کیونکہ:

میرے بھی نہیں بس میں یہ طبع رواں منظر   بہتا ہوا دریا ہے کیا جانے کہاں ٹھہرے

تو جناب والا! ادبی دنیا میں "توارد" اور "سرقے" کی ان گنت مثالیں آپ کی نظر سے بھی گزرتی رہی ہیں۔ لیکن پوری مطبوعہ غزل پر "سرقہ بالجبر" یا ڈاکہ پڑتے آپ نے شاذو نادر ہی دیکھا ہوگا۔ اور وہ غزل

بھی کہاں شائع ہوئی؟ "الاقرباء" جلد نمبر ۴ شمارہ ۲ اپریل تا جون ۲۰۰۱ء کا صفحہ ۱۳۷ ملاحظہ کیجئے۔ منظر ایوبی کی دو غزلیں جس غزل کا مطلع ہے:

ایام بہاروں کے یوں ہی نہ گزر جائیں　　　　کچھ پھول تو کھل جائیں کچھ زخم تو بھر جائیں

ملاحظہ کیجئے ص ۱۲۵ شمارہ جنوری۔ مارچ ۲۰۰۲ء "الاقرباء"۔

جناب۔ یہ خاکسار چونکہ تمام تحریریں حرف بہ حرف پڑھتا ہے' اس باعث اپنی غزل پر نظر پڑ گئی۔ بصورت دیگر سروشہ خان کی "بیاض" کی زینت بنی رہتی۔

نشاندہی ہم نے کر دی' اس کا حدود اربعہ آپ معلوم کر کے ادبی عدالت سے قانون (اگر کوئی ہے) کے مطابق سزا دلوا کر ممنون فرمائیں۔☆

اس سے قبل بھی میری کئی غزلیں خواتین نے اپنے ناموں سے مختلف جرائد میں شائع کرانے کی کوششیں کی تھیں۔ مگر آج سے کئی عشرے قبل (جب روزنامہ جنگ کے ادبی صفحے کے انچارج محترم شفیع عقیل تھے) "جنگ" کے ادبی صفحے پر میری اس زمانے کی مشہور غزل مطلع ہے:

کس کو یہاں شعور غم کون ستم شناس ہے　　　　کل بھی رہا تھا جی اداس آج بھی جی اداس ہے

نمایاں طور پر شائع ہوئی تو اس کی تردید اور میری مطبوعہ غزل شفیع عقیل صاحب نے "جنگ" میں خوبصورت انداز میں شائع کر کے شاعرہ کی جسارت بے جا پر ایسی کاری ضرب لگائی تھی کہ وہ تقریباً ۳۰ برس کے بعد دوبارہ ادبی دنیا میں غزل سرا ہوئیں۔ آج کی معروف شاعرات میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

نہ جانے کیوں' بعض شاعرات میرے "مال" پر ہاتھ صاف کرنے کی خواہش مند رہتی ہیں جبکہ میرے کلام میں بہ اعتبار موضوع وہ چاشنی' وہ جاذبیت اور جمالیات کے وہ عناصر بڑی حد تک موجود نہیں جو خواتین کو مرغوب ہوتے ہیں۔ آپ اپنے ریکارڈ سے میری نشاندہی کی تصدیق کر سکتے ہیں' یعنی گزشتہ تین برس کے فائل سے!

☆ جناب منظر ایوبی نے نہایت سنگین صورت حال کی طرف توجہ دلائی چنانچہ ہم نے فوراً ہی "الاقرباء" کے ریکارڈ سے تصدیق کی کہ واقعی منظر صاحب کی غزل جو ۲۰۰۱ء میں تین سال قبل شائع ہوئی تھی وہی غزل حرف بہ حرف ۲۰۰۲ء میں محترمہ سروشہ خاں کے نام سے طبع ہوئی چنانچہ ہم نے "شاعرہ" سے ٹیلیفون پر رابطہ کیا انہوں نے فرمایا کہ وہ اپنا کلام "الاقرباء" کی نذر کر کے بیرون ملک چلی گئی تھیں متعلقہ شمارہ ان کی غیر حاضری ہی میں منظر عام پر آیا جسے وہ نہ دیکھ سکیں۔ مزید ارشاد ہوا کہ وہ مطالعہ کے دوران اپنی پسند کے اشعار اپنے پاس عادتاً محفوظ کر لیتی ہیں چنانچہ سہواً وہ کاغذ جس پر منظر ایوبی صاحب کی غزل درج تھی "الاقرباء" کی نذر ہو گیا جس پر وہ انتہائی شرمندہ اور معذرت خواہ ہیں۔ محترمہ کے اس بیان کے بعد ادارہ اس پر کوئی تبصرہ کرنا نہیں چاہتا البتہ ہم محترم منظر ایوبی صاحب سے جن سے ہمارے دیرینہ مراسم ہیں خود بھی صمیم قلب سے معذرت خواہ ہیں کہ ایک سہو ہم سے بھی ہوا ہے۔ (ادارہ)

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن۔ لاہور

سہ ماہی "الاقرباء" شمارہ جولائی تا ستمبر ۲۰۰۲ء ملا' شکریہ۔ پروفیسر سید وقار عظیم مرحوم کے بارے میں ڈاکٹر معز الدین کا خاکہ بہت دلچسپ ہے یہ موضوع اور محرر ہر دو کے شایان شان ہے۔

افسانوں اور افسانے کے فن پر سید وقار عظیم کی ابتدائی تالیفات ۱۹۴۴ء کی ہیں اور یہ پہلی بار سرسوتی پبلیشنگ ہاؤس' الہ آباد سے ۱۹۴۵ء میں چھپیں۔ ڈاکٹر صاحب کے خاکے میں ان کتابوں کی پہلی اشاعت کا زمانہ "۴۳۔۱۹۴۴ء چھپ گیا ہے' اسے کمپوزنگ کی غلطی خیال کرنا چاہیے۔

جعفر بلوچ۔ لاہور

اللہ کرے آپ ہر طرح خیر و عافیت سے ہوں۔ پچھلے دنوں بہاول پور والے پروفیسر سید محمد عارف صاحب لاہور وارد تھے۔ مجھے بھی انھوں نے شرف ملاقات بخشا۔ وہ بتا رہے تھے کہ انہیں آپ سے شرف تلمذ حاصل ہے۔

ایک غزل "الاقرباء" میں اشاعت کے لئے بھیج رہا ہوں۔ تازہ اور غیر مطبوعہ ہے۔ ایک اور کتاب "مجالس اقبال" بھی آپ کی خدمت میں ارسال کی جا رہی ہے اس کا دوسرا نسخہ برادر مکرم پروفیسر ڈاکٹر توصیف تبسم صاحب کی نذر ہے۔ انشاء اللہ یہ کتاب آپ حضرات کے لئے خوشنودی خاطر کا باعث ہوگی۔

امتیاز ساغر۔ کراچی

الاقرباء کا تازہ شمارہ پیش نظر ہے' آپ کی محنت اور علم و ادب سے محبت کے رنگ ہر صفحہ پر بہار دکھا رہے ہیں۔ رسالے کا معیار خوب سے خوب تر کی راہ میں تیزی سے گامزن نظر آتا ہے۔ آپ (مع احباب) مبارکباد قبول فرمائیں۔ سید مرتضیٰ موسوی' ڈاکٹر محمد معز الدین' ڈاکٹر عطش درانی اور میاں غلام قادر کی تحریریں نہایت سبک اور معلوماتی ہیں دراصل ایسی تحریروں کی اشاعت ہی کسی جریدے کا معیار متعین کرتی ہیں۔ صد شکر کہ الاقرباء کو ایسی تحریریں نصیب ہیں۔ شاعری کا حصہ بھی کافی خوش رنگ ہے محترم سید رفیق عزیزی کی غزل ان کے باطن کا عکس ہے:

آبرو مند بہر حال ترا عشق رہا — ہم جو رسوا سر بازار ہوئے بھی تو کیا

ایسی غزلیں ذہن و دل کو منور کر دیتی ہیں۔

میاں غلام قادر۔ اسلام آباد

اسلام آباد سے شائع ہونے والے ''تعلیم و ثقافت کی اعلیٰ قدروں کے نقیب'' رسالے سہ ماہی ''الاقرباء'' کے شمارے اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۲ء (یادِ اقبال) میں ڈاکٹر محمد صدیق خاں شبلی کا مضمون ''گوئٹے کا دیوانِ مغربی'' پڑھ کر راقم الحروف پہلے خوب ہنسا اور بعد میں رو دیا۔ ہنسا اس لئے کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے مضمون کا بیشتر حصہ ''دیوانِ شرق و غرب'' کے ''عرضِ مترجم'' سے بغیر حوالہ دیئے اپنایا ہے اور جو کچھ باقی بچتا ہے وہ بھی بغیر حوالہ دیئے گوئٹے پر لکھی گئی دیگر تحریروں سے اخذ کیا ہے جو واقعی قابلِ داد ہے۔

''این کار از تو آید و مردان چنیں کنند''

رہی راقم الحروف کے رونے والی بات تو وہ بات یوں ہے کہ ''عرضِ مترجم'' سے بھرپور استفادہ کے بعد شبلی صاحب نے اپنے مضمون کے آخر میں فرمایا ہے:

''گوئٹے کی تمام تخلیقات کے تراجم دنیا کی مختلف زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ ورتھر کی داستانِ غم اور فاؤسٹ کے اردو میں تراجم ساٹھ ستر سال پہلے ہوئے لیکن دیوان کے ترجمے کی طرف توجہ نہیں دی گئی۔ کچھ انفرادی کوششیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ انگریزی سے گوئٹے کی بعض نظموں کے اردو میں ترجمے کئے گئے ہیں۔ نیشنل بک فاؤنڈیشن نے ۲۰۰۲ء میں دیوان کا ایک مکمل ترجمہ شائع کیا ہے۔ اس کے مترجم انجینئر میاں غلام قادر ہیں۔ موجودہ صورتِ حال میں نثری ترجمہ بھی غنیمت ہے۔''

واہ! شبلی صاحب واہ! بقول مرزا غالب:

شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا   آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا

''یہ نثری ترجمہ بھی غنیمت ہے'' کہہ کر آپ نے حقِ حقدار کا حقہ ادا کر دیا۔ یعنی:

''ہماری جان گئی آپ کی ادا ٹھہری!''

شاعرِ المانوی یوہان وولف گانگ فان گوئٹے کے West-oestlicher دیوان کا مکمل اُردو نثری ترجمہ نیشنل بک فاؤنڈیشن نے ۲۰۰۱ء میں شائع کیا۔ اس کی رونمائی کی پہلی تقریب ۱۶ مارچ ۲۰۰۲ء کو علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد میں منعقد کی گئی جس سے نیشنل بک فاؤنڈیشن کے ایم ڈی احمد فراز، دیوان کے مترجم میاں غلام قادر (راقم الحروف) ڈاکٹر الطاف حسین، وائس چانسلر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، پروفیسر فتح محمد ملک، ڈاکٹر صدیق شبلی اور ڈاکٹر نثار قریشی نے خطاب کیا۔ عام قاعدے کے مطابق تمام مقررین کو دیوان کا

ایک ایک نسخہ پیشگی پیش کیا گیا تھا تاکہ وہ اس کے مندرجات سے آگاہ ہوں۔ مقام شکر ہے کہ اس ترجمے کو سراہا گیا اور ڈاکٹر سید الطاف حسین نے اپنے خطاب میں فرمایا کہ "اقبال اور گوئٹے کے افکار کے تقابلی رویوں پر بہت کچھ لکھا گیا ہے مگر اس دیوان کو مکمل صورت میں اردو زبان میں پیش کرنے کی سعادت میاں غلام قادر کے نصیب میں لکھی تھی۔" انہوں نے کہا "یہ خوشی کی بات ہے کہ اوپن یونیورسٹی کو مغرب کے ایسے مفکر کی کتاب کے ترجمے کی رونمائی کا موقع ملا جو اسلام اور تعلیمات محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا شیدائی تھا۔"

راقم الحروف نے جب دیوان کے متعلق تعارفی کلمات شروع کئے تو جناب احمد فراز نے فرمائش کی کہ کچھ ان دشواریوں کا تذکرہ کیا جائے جو مترجم کو ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنے میں پیش آئیں۔ یہ موضوع خاصا دلچسپ تھا اس لئے اس پر عرصے کی بات چیت ہوئی راقم الحروف نے "دیوان شرق وغرب" کے متعلق عرض کیا کہ مترجم نے یہ ترجمہ بڑی عرق ریزی سے کئی سال کی محنت شاقہ کے بعد کیا ہے۔

مشفق خواجہ۔ کراچی

آپ کے موقر جریدے "الاقرباء" کے اب تک تین شمارے مل چکے ہیں اس عنایت کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ اردو میں ایسے رسالے کم ہیں جو علمی بھی ہوں اور ادبی بھی۔ "الاقرباء" اس کمی کو نہایت خوش اسلوبی سے پورا کرتا ہے۔ آپ کا رسالہ غالب لائبریری میں اعزازی طور پر آتا ہے میں اسے پہلے شمارے سے دیکھ رہا ہوں۔ آپ کی اس عنایت کا ایک مرتبہ پھر شکریہ ادا کرتا ہوں۔

ڈاکٹر غلام شبیر رانا۔ جھنگ

مجلہ الاقرباء (جولائی تا ستمبر ۲۰۰۴) موصول ہوا۔ قدر افزائی کے لئے سپاس گزار ہوں۔ "مغرب میں اردو زبان وادب کے امکانات" فکر انگیز اداریہ ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر عاصی کرنالی کی تحریریں متعدد تجربوں اور بصیرتوں سے لبریز ہوتی ہیں۔ اُن کا اسلوب ہماری تہذیبی اقدار و روایات کو حقیقی معنویت سے آشنا کرتا ہے۔ نعتیہ شاعری پر ان کی تحریر بہت پسند آئی۔ لیکن اُن کی شگفتہ تحریر ہے حمد میں بھی وہ اسلوب کی بلندی پر ہیں، نعت اور غزل بھی عمدہ ترین ہے ڈاکٹر محمد معز الدین، ڈاکٹر خیال امروہوی، سید رفیق عزیزی، گفتار خیالی، گلنار آفرین، نغمہ زیدی، سید مشکور حسین یاد، سروشہ خان، نعیم فاطمہ علوی، افشاں قاضی، ڈاکٹر توصیف تبسم اور ڈاکٹر سید محمد عارف کی تحریریں اپنی افادیت اور تاثیر کا لوہا منوا رہی ہیں۔

اس شمارے میں شامل سید منصور عاقل کا انٹرویو بہت پسند آیا۔ بہت سے اہم امور پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ بدلتے ہوئے زمانے میں معاشرتی حالات بھی متغیر ہیں۔ ان حالات میں تشکیلی عوامل کا متاثر ہونا ایک قابل فہم بات ہے۔ سید منصور عاقل ہماری تہذیبی اور ملی اقدار و روایات کے امین ہیں ان کی باتیں دل میں اترتی چلی گئیں۔ حالات میں گمبھیر پن اور بے یقینی کی جو کیفیت ہے اس سے تخلیق کار کا متاثر ہونا بعید از قیاس نہیں۔ گلنار آفرین کی شاعری اس حقیقت کی مظہر ہے

ایسے حالات میں کیسے زندہ رہیں　　اب یقیں ہے کوئی اور نہ کوئی گماں

سید منصور عاقل نے اپنی روشن خیالی کے اعجاز سے فکر و نظر کو منفرد انداز میں مہمیز کیا ہے

نہ زادِ راہ نہ منزل نہ جادہ رکھتے ہیں　　سفر ہے شرط، سفر کا ارادہ رکھتے ہیں

یہ اشعار کلاسیکی ادب اور جدید ادب کے درمیان ارتباط اور سنگم کا نمونہ ہیں، وجدان کی مضبوط، مستحکم اور پرزور لہریں قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں سید منصور عاقل کی شاعری کا یہی اعزاز و امتیاز ہے

ہماری حرماں دلی کا سبب کچھ اور نہیں　　یہی کہ ان سے توقع زیادہ رکھتے ہیں

میں بجا طور پر یہ توقع رکھتا ہوں کہ "الاقرباء" کے منتظمین معتبر ربط کا یہ مؤثر سلسلہ برقرار رکھیں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے۔

مشکور حسین یاد۔ لاہور

جولائی، ستمبر ۲۰۰۲ء کا تازہ الاقرباء دو دن ہوئے مجھے ملا حسب معمول اپنی مطبوعہ دو غزلوں کو پڑھ کر آپ کا اداریہ پڑھا "مغرب میں اردو زبان و ادب کے امکانات" ادھر میں بھی جب سے ریٹائر ہوا ہوں یعنی ۱۹۸۵ء سے مسلسل باہر جا رہا ہوں۔ کیا امریکہ کیا کینیڈا کیا یورپ ان ممالک میں اردو ترقی کر رہی ہے مگر جن لوگوں کے ہاتھوں ترقی کر رہی ہے ان لکھنے والوں کو صرف اپنی فکر ہے یعنی شہرت حاصل کرنے کی فکر باقی ان کے خود گھروں میں یا ان کے ارد گرد اردو بولنے والوں کا کیا حال ہے۔ اس سے یہ لوگ ایک اعتبار سے بے خبر ہی سے ہیں۔ ان کی اولاد زیادہ تر انگریزی سے مانوس ہو رہی ہے۔ اور اردو زبان سے بیگانہ اور ان لوگوں کو اس خطرناک صورت حال سے نہ اتنا خوف ہے اور نہ ہی اس صورت حال کی اصلیت سے وہ واقف ہیں یا واقف نہیں ہونا چاہتے۔۔۔ بس کبھی کبھی آنسو بہا لیتے ہیں اپنے آپ کو اور ہمیں دھوکا دینے کے لئے باقی اللہ اللہ خیر صلا۔۔۔ خدا کرے ایسا نہ ہو ویسے میرا خیال ہے تیس چالیس تک یہ مشاعروں کا سلسلہ بھی ختم ہو جائے

گا اور یہ لوگ مر مرا جائیں گے یا بوڑھے ہو جائیں گے۔

باقی رہی یہ بات کہ آجکل مغرب کے یہ اردو بولنے والے حضرات آپ کے قول کے مطابق "معصومانِ ادب" کس طرح شاعر یا ادیب بننے کے جنون میں مبتلا ہیں اور کس طرح ہمارے ابن الوقت اُن سے پیسہ بٹورتے ہیں اور کس طرح معصومانِ ادب ان کی آؤ بھگت کرتے ہیں اور پھر اس کے عوض ہمارے یہ دریوزہ گر کیونکر ان معصومانِ ادب کی یہاں آؤ بھگت کرتے ہیں یہ سب کاروبار چل رہا ہے آپ بھی جانتے ہیں میں بھی جانتا ہوں لیکن ہم میں اتنی ہمت نہیں کہ ان کا نام لے کر انہیں للکار سکیں۔ بس اشاروں کنایوں ہی میں ہم باتیں کرتے ہیں۔۔۔۔ اور یہ جو دریوزہ گر ہمیں بزعم خویش نااہل سمجھتے ہوئے ہم پر مُسکراتے ہیں اور صحیح مسکراتے ہیں کہ ہم وہ نہیں کر سکتے جو یہ کرتے ہیں۔۔۔۔ اس کے علاوہ ایک اور بات سنئے جب ۱۹۹۳ء میں پہلی بار اردو انٹرنیشنل کی تیر صاحبہ نے مجھے شاعری کے لئے امریکہ بلایا تو جانے سے پہلے مجھے قتیل شفائی مرحوم نے کہا "ایک بوریت کے لئے پہلے سے تیار ہو کر جاؤ کہ جو شاعر تمہارے ساتھ پاکستان سے جا رہے ہیں وہ چاہے کوئی بھی ہو جو غزل نظم وہ پہلے مشاعرے میں سنائیں گے بس ان سے وہی نظم و غزل تم بار بار ہر مشاعرے میں سنو گے" اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ میں نے کہا یار و کچھ تو خوفِ خدا کرو آجکل ہر مشاعرہ ریکارڈ ہوتا ہے جب دوسرے شہروں میں بھی لوگ وہی کچھ سنیں گے تو کیا ہم پر لعنت نہیں بھیجیں گے۔

مضطر اکبر آبادی۔ راولپنڈی

جولائی ستمبر کا "الاقرباء" ملا۔ مغرب میں اردو زبان و ادب کے امکانات پر اداریہ اردو کی ترویج و ترقی کا صحیح معنوں میں عکاس و آئینہ دار ہے۔ نعتیہ شاعری سے متعلق مضمون میں جن نزاکتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ یقیناً قابلِ عمل ہیں لیکن مضمون طویل بہت ہے ذرا اختصار سے کام لیا جاتا تو بہتر تھا۔ "اردو رباعی کا سفر" میں مشاہیر کی رباعیات بہت کم درج کی گئی ہیں۔ وقار عظیم اردو افسانے کے مستند نقاد تھے اُن کی تنقیدی صلاحیتوں کا پوری طرح جائزہ نہیں لیا گیا۔ ملا واحدی اور پشاور کے بارے میں مضامین بہت معلوماتی ہیں۔ مراسلات میں بعض مراسلے بے حد طویل ہیں ایک تازہ غزل ارسال ہے۔

نوید سروش۔ میرپور خاص

سہ ماہی "الاقرباء" کا تازہ شمارہ جولائی تا ستمبر ۲۰۰۲ء نظر نواز ہوا۔ آپ جس خلوص سے "الاقرباء" ارسال کرتے ہیں اُس کے لئے میں ممنون ہوں۔

پرچے میں شامل ہر حصے کی نگارشات اہم ہیں۔آپ کے اداریے "مغرب میں اردو زبان وادب کے امکانات" بہت اہم موضوع ہے۔اس موضوع پر مضامین شائع کیے جائیں یا پھر مذاکرے کی صورت میں اہل علم وفن کی گفتگو پرچے میں آنی چاہیے۔ یہ ایک تجویز ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر عاصی کرنالی کا مضمون "نعتیہ شاعری تباحتیں اورنزاکتیں" اہم اور نازک موضوع پر ہے جسے انہوں نے عمدگی سے پورا کیا ہے۔نغمہ زیدی نے "اقبال کا قرآنی تصورابلیس" پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔اگر آخر میں حواشی دے دیے جاتے تو بہتر تھا۔حمایت صاحب کی تحریر "رحمان بابا (پشتو کا ایک عظیم شاعر)" خوب ہے۔امید ہے آئندہ بھی ہماری صوبائی اور علاقائی زبان وادب کے اہل علم وفن پر مضامین آتے رہیں گے تاکہ اردو جاننے والے اُن کے فن سے بھی واقف ہوں۔ افشاں قاضی کا مضمون "اردو رباعی کا سفر فراق تک" ایک کمزور مضمون ہے عنوان بہت جاندار مگر یہ مضمون "توقع پر پورا نہیں اُترا میاں غلام قادر کی تحریر "گوبے کی داستان عشق" دلچسپ ہے۔میاں غلام قادر صاحب نے اپنے ایک استاد جناب پنڈت گپتی رام کی پرکشش شخصیت کا اچھا خاکہ کھینچا ہے۔پنڈت صاحب پر تو ایک پورا مضمون آنا چاہیے۔نوید ظفر نے پشاور کی سیر خوب کروائی ہے۔

ڈاکٹر عاصی کرنالی صاحب کا انشائیہ "لکیریں" اور نسیم فاطمہ علوی کا افسانہ "روشن ستارا" متاثر نہیں کر سکے۔ پروفیسر ڈاکٹر معزالدین کی پروفیسر سید وقار عظیم پر تحریر متاثر کن ہے۔حمد ونعت کا انتخاب دل و دماغ کو روشن کر گیا۔غزلیات، رباعیات اور قطعات کا انتخاب بہترین ہے۔

نظموں میں محشر زیدی (تلقین صبر) پروفیسر آفاق صدیقی (اجڑے گھر کی یاد) اور گلنار آفرین (سمندر اور زندگی) سے بہت لطف اندوز ہوا۔نقد ونظر میں مبصرین نے کتب پر تبصرہ کا حق ادا کر دیا ہے۔

"الاقرباء" کی ایک انفرادیت خبر نامہ بھی ہے۔ اس حصے کی ہر چیز میں دلچسپی کا عنصر نمایاں ہے۔اس شمارے میں آپ کا انٹرویو بہت اہم ہے اس تفصیلی گفتگو سے بہت سی باتیں معلوم ہوئیں۔

میں کسی بھی پرچے میں سب سے پہلے خطوط کا مطالعہ کرتا ہوں اہل علم کے سنجیدہ خطوط نظریہ سازی کا کام بھی کرتے ہیں۔اس شمارے میں مشکور حسین یاد، محشر زیدی، پروفیسر ڈاکٹر خیال امروہی اور بابر نسیم آسی کے خطوط بہت اہم ہیں۔خصوصاً محشر زیدی اور نسیم بابر آسی کے خطوں نے تو آنکھیں کھول دیں۔

منصور عاقل صاحب یہ آپ کی جرأت مندی ہے کہ آپ بڑی غیر جانب داری سے ہر قسم کے خطوط شائع کرتے ہیں اور خود پر تنقید برداشت کرنے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔آپ کی کاوشیں لائق تحسین اور قابل تقلید ہیں۔

امجد قریشی۔ بہاولپور

تازہ شمارہ ہر اعتبار سے قابلِ داد ہے آپ اداریہ میں جس انداز سے تبصرہ کرتے ہیں اس کے لئے مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اس بار بھی آپ اہم مسئلہ کو زیرِ بحث لائے ہیں اردو کے بارے میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ درست ہے لیکن بدقسمتی تو یہ ہے یہ زبان جسے ہم قومی زبان کہتے ہیں اپنے ملک میں اجنبی ہے ہمارے حکمران ہوں یا مراعات یافتہ طبقہ کے لوگ ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ اردو زبان بولنا اور اسے سرکاری زبان کے طور پر رائج کرنا ان کے بس میں نہیں میں تو ان لوگوں کو انگریزی کا غلام کہتا ہوں حالانکہ ملک کے دستور کے مطابق اردو کو سرکاری زبان کے طور پر رائج ہونا چاہیے میرے خیال میں یہ دستور کی صریح خلاف ورزی ہے بہر حال اردو اپنے ہی ملک میں مظلوم ہے۔ اس بار بھی حصہ نثر میں بعض مضامین بڑے فکر انگیز ہیں ان میں پروفیسر ڈاکٹر عاصی کرنالی کا مقالہ نعتیہ شعری قباحتیں اور نزاکتیں خوب ہے۔ محترم عاصی کرنالی نے بڑے اہم نکات اٹھائے ہیں اسی طرح نفیس زیدی کا مضمون اقبال کا قرآنی تصورِ ابلیس بھی خوب ہے مُلّا واحدی کے بارے میں بھی محمد شفیع عارف کا مضمون بہت اچھا ہے اسی طرح حصہ نظم بھی خاصا جاندار ہے۔ الاقربا نے ادبی دنیا میں اپنی ایک الگ شناخت بنالی ہے۔ سید منصور عاقل اور ان کی ٹیم مبارکباد کی مستحق ہے کہ خوب سے خوب تر کی تلاش کا سفر جاری ہے۔

مسلم شمیم۔ کراچی

جولائی ستمبر ۲۰۰۲ء کا الاقربا موصول ہوا۔ یہ شمارہ بہت خوبصورت لگا بہت پسند آیا اس لئے نہیں کہ اس شمارے میں متعدد حوالوں سے میرا نام چھپا ہے بلکہ اپنے Form اور Content ہر دو اعتبار سے یعنی ظاہری اور باطنی خصوصیات یکساں متاثر کن ہیں۔ مغرب میں اردو زبان وادب کے امکانات کے زیرِ عنوان اداریہ مغز بھی ہے اور پُر معنی بھی۔ اردو دنیا کی وسعتوں کا بیان جن حوالوں سے کیا گیا ہے وہ خوب ہے۔ اس زبان کی پذیرائی اور لسانی عالمگیریت کے خدوخال کی ترتیب و تشکیل میں جو کچھ کیا جا رہا ہے۔ وہ زبان اردو کے روشن تر اور وسیع تر مستقبل کی نشاندہی کرتا ہے۔ مغرب میں جا کر بس جانے والے جس طرح اپنے ثقافتی ورثے یعنی اپنی زبان وادب کے لئے کوشاں ہیں وہ واقعی قابلِ تحسین ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہاں آباد ہونے والے قلم کاران معاشروں کے اقدار اور طرزِ احساس سے بیگانہ نہیں رہ سکتے لہٰذا ان کی حیثیت میں نئے رویوں

اور رجحانات کا در آنا قرین قیاس ہی نہیں خوش آئند بھی ہے۔ مغرب اس وقت فکر و شعور کا مرکز و محور ہے۔ کھلا ذہن رکھنے والے ادیب مغرب کی ترقی یافتہ معاشرتی قدروں کی اردو ادب میں ترجمانی کر کے اپنی زبان کو وسعت دے رہے ہیں اور مشرقی تہذیب کے لئے مغرب میں نرم گوشہ پیدا کر رہے ہیں آپ نے وہاں کی اردو دنیا کی کالی بھیڑوں کا بر محل نوٹس لیا ہے اور ان قلم پیشہ زائرین مغرب کو بہت ہی ٹھیک انداز میں ہدف بنایا ہے۔ ہمارے شہر میں یہ باضابطہ کاروباری ادارے کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔ آپ کا تفصیلی انٹرویو بھی پڑھا مستفید بھی ہوا اور محظوظ بھی۔ زبان اردو کے باب میں آپ کی رائے صائب ہے کہ اردو زبان کی ہمہ جہتی و ہمہ گیری کا بنیادی سبب اس کی تحلیل و انجذاب کی لسانی صلاحیت ہے بہ لفاظ دیگر آپ نے یہ بڑی درست بات بتائی ہے کہ اردو زبان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں دوسری زبان کے الفاظ جذب ہو جاتے ہیں جن دیگر مضامین نے میری توجہ خصوصیت سے مبذول کرائی ان میں جناب حمایت علی شاعر کا مضمون رحمان بابا کے علاوہ اردو رباعی کا سفر فراق تک تحریر کردہ افشاں قاضی، گوئٹے کی داستان عشق تحریر کردہ میاں غلام قادر۔ "رحمان بابا" مضمون کے اختتام پر شائع شدہ ایک مختصر اشتہار اسلام کو بدنام نہ کریں۔ بے حد پسند آیا یہ وقت کی پکار ہے یہ روح عصری آواز ہے۔ کراچی شہر خصوصیت کے ساتھ ماضی قریب میں جس وحشت و بربریت کا ہدف بنا اور مذہبی انتہا پسندی اور جنون کے جو بھیانک مناظر اس شہر کا نصیب بنے اور عالمی تناظر میں بھی یہ اشتہار بڑی معنویت کا حامل ہے۔ مسلم امہ کو موجودہ جنون اور انتہا پسندی سے نکالنا وقت کا اہم ترین تقاضا ہے۔ امن و سلامتی اور انسان دوستی اسلام کے بنیادی ستون کہے جاسکتے ہیں ہم ان سے انحراف کر کے جس راہ پر گامزن ہیں وہ اجتماعی خودکشی کا سفر ہے۔ مسلم امہ یعنی تقریباً ۵۷ مسلم ممالک میں کہیں بھی کوئی قابل ذکر سائنسی ریسرچ کی روایت نہیں ہے ہم آج کی دنیا میں محض consumers ہیں اور جن ایجادات اور دریافتوں سے (Inventions and discoveries) مستفید ہو رہے ہیں ان میں ہمارا کوئی حصہ نہیں ہے ضرورت اس بات کی ہے ہم ترقی کے موجود امکانات اور تقاضوں کا ادراک حاصل کریں اور ترقی کیلئے کوشاں ہو جائیں۔ یہ وہ نکتہ ہے جو آج سے تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل سر سید احمد خان نے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

زیر نظر شمارے کی ادبی اور علمی قدر و قیمت کا تعین کرنے کے لئے اس میں شامل بہت سی تحریریں اور نگارشات ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر عاصی کرنالی کا مقالہ "نعتیہ شاعری" خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔ غرض یہ کہ یہ شمارہ دیگر شماروں کی طرح متوازن اور معتبر ہے جس میں مختلف مکاتیب فکر کے قلم کاروں کی تحریریں شامل

ہیں جن کے باعث یہ شمارہ اور آپ کا ادارہ ایک وسیع فورم (Forum) بن گئے ہیں۔ یہ روشن خیالی اور خرد افروزی کی روایت کی خصوصیت ہے۔

اپنی نثری تحریر بھی ارسال خدمت کروں گا۔ سردست اپنی دو نظمیں دو اکابر کے حوالے سے منسلک کر رہا ہوں۔ ہاں ایک بات کہنے سے رہ گئی ہے اور وہ ہے تبصرۂ کتب کا شعبہ۔ مجھے اپنی کتاب ''تناظر'' پر ڈاکٹر توصیف تبسم کا تبصرہ بہت پسند آیا اختصار کے ساتھ جس جامعیت سے کتاب پر رائے زنی کی گئی ہے اس کا اعتراف نہ کرنا کوتاہی ہوگی ڈاکٹر توصیف تبسم کو میرا سلام اور شکریہ کہہ دیں۔ ان کے دیگر تبصرے بھی پڑھے اور جامعیت اور اختصار کے ساتھ باتوں کو سمیٹنے کا جو ہر وہ رکھتے ہیں قابل ستائش ہے۔

گفتار خیالی۔ مظفر گڑھ

رسالے کے مندرجات میں ابھی تک حصہ مضامین میں ''نعتیہ شاعری قباحتیں اور نزاکتیں'' از استاد محترم پروفیسر عاصی کرنالی، رحمان بابا پر حمایت علی شاعر کا مضمون گوئٹے کی داستان عشق، اردو رباعی کا سفر فراق تک افشاں قاضی صاحبہ اور سید محمد ارتضی ملا واحدی از محمد شفیع عارف دہلوی مطالعے کی تحریریں ہیں انشائیہ ''لکیریں'' ڈاکٹر عاصی کرنالی۔ پروفیسر وقار عظیم عظمت و استقامت کا پیکر پڑھنے کی چیزیں ہیں۔

منظومات غزلیں ڈاکٹر عاصی کرنالی۔ سلطان صبروانی عبدالعزیز خالد، پروفیسر ڈاکٹر خیال امروہوی، صادق نسیم اور منصور عاقل کے علاوہ گلنار آفرین خوب پسند آئیں۔ ڈاکٹر خیال امروہوی کے قطعات بھی دل کو لگے الاقرباء سہ ماہی کا اداریہ مغرب میں اردو زبان و ادب کے امکانات'' خاصی معلومات مہیا کرتا ہے''۔

سید محبوب حسن واسطی۔ کراچی

جولائی ستمبر ۲۰۰۲ کا الاقرباء کا تازہ شمارہ ملا۔ دیکھ کر طبیعت خوش ہوگئی۔ ظاہراً دیدہ زیب بھی باطناً انتہائی اعلیٰ معیاری مضامین سے آراستہ بھی پروفیسر ڈاکٹر عاصی کرنالی کا مضمون نعتیہ شاعری، قباحتیں اور نزاکتیں خصوصی دلچسپی سے پڑھا۔ بے حد پسند آیا۔

محترم پروفیسر صاحب نے نعت کے موضوع پر تنقیدی اور تحقیقی مضامین لکھنے والے متعدد اہل قلم کے بارے میں لکھا ہے انہوں نے نہایت ادب آمیز جرأت کے ساتھ، بہت سی کام کی باتیں لکھی ہیں اور لکھ رہے ہیں حتیٰ کہ احتیاط کا یہ عالم ہے کہ اگر کسی نعتیہ شعر پر تحسین کی جاتی ہے تو شاعر کا نام درج ہوتا ہے۔ اگر کہیں تنقید و تعریض

ہوتی ہے اور کوئی اختلافی بات لکھی جاتی ہے تو شاعر کا حوالہ حذف ہوتا ہے۔ یہ روش نہایت قابل تعریف ہے۔ بات بھی ہو جاتی ہے اور پردہ بھی رہ جاتا ہے۔ محترم پروفیسر عاصی کرنالی صاحب نے اپنے بارہ (۱۲) موانعات نعت و ممنوعات ثنائے رسول ﷺ بیان کرتے ہوئے اپنی یہی روش رکھی ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

''میں نے اس مضمون میں عموماً مثالوں سے اور حوالوں سے عمداً گریز کیا ہے اسلئے کہ مرحوم شعراء تو اب دنیائے آب و گل میں نہیں ہیں لیکن معاصر شعراء یا اُنکے ہوا خواہوں سے یہ اندیشہ ضرور ہے کہ وہ میری رائے سے متفق نہ ہوں یا مجھ سے خفگی کا اظہار فرمائیں۔۔۔''

محترم پروفیسر صاحب کی خدمت میں مودبانہ عرض ہے کہ وہ اس خصوصی احتیاط کی بنا پر صرف شعراء کے نام ذکر نہ کرتے تو حرج نہ تھا مگر وہ قابل اعتراض تعتیہ مصرعے یا اشعار تو ضرور درج فرما دیتے کہ توضیح مطالب و تنقیح موضوع میں جو قدرے تشنگی رہ گئی وہ تو دور ہو جاتی اور بات زیادہ واضح ہو جاتی مثلاً پہلی مانع نعت و ممنوع ثناء رسولؐ (''سراپا نگاری'' ''محبوبان مجازی کے ذہنی تلازمات و لوازمات'' ''محبوبان مجازی کے کوچہ و بازاری ترجمانی'') کے سلسلہ میں محترم پروفیسر صاحب نے کوئی مثال درج نہیں کی اور اس لئے بات تشنہ رہ گئی۔ دوسری مانع نعت (''جسارت و بے تکلفی'') کے سلسلہ میں آنجناب نے صرف ایک مصرعہ ''قم یا حبیبی۔ کم تنامی'' پر اکتفا کیا۔ تیسری مانع نعت (افراط و تفریط) کے سلسلہ میں مصرعہ اللہ کے پلے میں وحدت کے سوا کیا ہے (دوسرا مصرعہ) جو کچھ مجھے لینا ہے لے لوں گا محمدؐ سے (یہ دوسرا مصرعہ پروفیسر صاحب نے ذکر نہیں کیا)، ''احد و احمدؐ میں صرف میم کا پردہ''۔ چوتھی مانع نعت (علوم و معارف نبویؐ) (حضورؐ کو اللہ کی مانند عالم غیب و شہود قرار دینا) یہاں بھی کوئی مثال درج نہیں۔

محترم پروفیسر کرنالی صاحب اردو ادبیات کے متبحر عالم اور استاد ہیں۔ مجھے ان پر اعتراض مقصود نہیں۔ گزارش صرف یہ ہے کہ وہ بعض معاصر شعراء یا ان کے ہوا خواہوں کے عدم اتفاق یا خفگی کا آخر اتنا خیال کیوں کریں۔ وہ اپنے موضوع کی تنقیح و توضیح و استدلال پر کیوں نہ نظر رکھیں۔ ہمیں تو ان سے یہ توقع ہے کہ اس موضوع پر کالج و یونیورسٹی کے طلباء و طالبات کیلئے وہ ایک ضخیم کتاب لکھیں تا کہ اردو ادبیات کے اعلیٰ مدارج کے طلباء اس سے استفادہ کر سکیں۔ بس یہ کافی ہے کہ وہ ان موانع نعت کے شعراء کا نام نہ لکھیں۔

اسی شمارہ کا دوسرا مضمون عبدالحمید اعظمی کا ''قدیم فارسی شعراء کے دواوین'' ہے۔ ڈاکٹر الیاس عشقی کا تجزیہ حقائق کا ترجمان معلوم ہوتا ہے۔ کتنے افسوس کا مقام ہے کہ ہم ایرانی شاعر شیخ علی حزین کو اتنی عزت

دیں اوران کی مدح سرائی کریں اور وہ ہم سے نفرت کریں۔ شاعر اور نفرت...... ! شاعر تو محبت کا ترجمان ہوتا ہے۔اس کے قلم سے تو محبتیں جنم لیتی ہیں۔ شعر و حکمت کا بھلا نفرت سے کیا تعلق!

پروفیسر آفاق صدیقی۔ کراچی

الاقرباء کا شمارہ نمبر ۳' جلد نمبر ۷' بابت جولائی تا ستمبر ۲۰۰۴ء مجھے بروقت مل گیا تھا۔ دلی شکر گزار اور ممنون کرم ہوں کہ صفحہ ۱۱۱ پر میرے چند اشعار یا بیت بعنوان "اجڑے گھر کی یاد" شامل اشاعت ہوئے۔ ان میں آخری بیت کا پہلا مصرعہ بھول چوک میں کچھ لکھ گیا تھا۔ اس غلطی کو آپ حضرات نے "تبدیلی بحر۔۔۔ حسن ایجاد کہ ایجاد حسن" پر محمول کیا۔ پڑھ کر بڑا لطف آیا۔ کاش ہمارے ادبی جریدوں کے مدیران محترم ایسی ہی نظر سے شامل اشاعت شعری تخلیقات کو دیکھ لیا کریں۔ اصل بیت کچھ یوں ہے کہ

البیلی کچھ صورتیاں جب میرے سامنے آتی ہیں ‎ ‎ ‎ دل تو اور کہیں ہوتا ہے انکھیاں دل بن جاتی ہیں

اور میں نے لکھا یوں ۔ ‎ ‎ ‎ کچھ البیلی صورتیاں

الاقرباء کا ہر شمارہ تازہ بتازہ شعری تخلیقات' دلکش افسانوں اور مضامین کے ساتھ بڑی عمدگی سے منظر عام پر آتا ہے۔ میرے نام جو آپ بھیجتے ہیں اس سے ادب کے کئی طالب علموں کا ذوق مطالعہ مستفیض ہوتا ہے۔

میں صمیم قلب سے آپ اور آپ کے رفقائے کار کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں اور معذرت خواہ ہوں کہ اظہار ممنونیت میں خاصی تاخیر ہو جاتی ہے کیونکہ کراچی کی تقریباتی مصروفیات میری اپنی معاشی تگ و دو اور سیدھے ہاتھ میں شدید درد کے سبب کچھ لکھنے میں کوتاہی ہوتی ہے۔ یہ اچھا نہیں لگتا کہ خط کسی اور سے لکھوا کر یا کمپوز کرا کے حاضر خدمت کروں۔

کچھ تحریریں حاضر خدمت ہیں جو غیر مطبوعہ اور تازہ ہیں۔ امید ہے آپ کو پسند آئیں گی۔ کیا اچھا ہو کہ آپ کبھی کراچی تشریف لائیں' ہم آپ کے اعزاز میں شایان شان محفل سجائیں اور آپ کے قدردان گلہائے عقیدت و محبت پیش فرمائیں۔

میری تازہ کتاب یعنی خودنوشت کی دوسری جلد عنقریب شائع ہو رہی ہے اس کے ایک ورق کی نقل بقلم خود حاضر ہے۔ کارساز حقیقی سلامت با کرامت رکھے۔

پروفیسر خیال آفاقی۔ کراچی

☆ حاشیہ ملاحظہ فرمایئے

☆ پروفیسر صاحب نے اپنے انیس ۱۹ صفحات (فل سکیپ) پر مشتمل مراسلہ کا اختتام یہ کہہ کر فرمایا ہے کہ" حکایت بود بے پایاں بہ خاموشی ادا کردم" بہرحال کلی ردعمل میں توازن یا عدم توازن ان کا اپنا مسئلہ ہے لیکن ہم معذرت خواہ ہیں کہ اول تو بخوف طوالت ہم ان کا مراسلہ نذر قارئین نہیں کر سکتے دوئم یہ کہ مراسلہ کی زبان اور لب ولہجہ ان کے شایان شان ہے اور نہ "الاقرباء" کسی ایسی تحریر کو جو ناگفتہ بہ القاب و آداب اور تذبذب یا ختہ جملوں پر مشتمل ہو معرض اشاعت میں لانے کا متحمل ہوسکتا ہے پس منظر یہ ہے کہ موصوف کا ایک مراسلہ الاقرباء کی اشاعت اپریل تا جون ۲۰۰۲ء (ص ۱۲۴۔ ۱۲۶) میں شائع ہوا جس میں بجملہ دیگر ارشادات یہ جملہ بھی شامل تھا کہ "الاقرباء میں چھپنے والی شاعری کوئی قابل رشک نہیں ہوتی وہی گھسے پٹے خیالات اور فرسودہ مضامین کوئی تنوع کوئی نیا پن نہیں" نیز ہمارے ایک محترم قلمی معاون پروفیسر ڈاکٹر خیالی امروہی کے اس شعر پر کہ "وجدان وکیف غالب خستہ کی جان تھے۔ ساغر قلم کتاب ہی ان کے نشان تھے"۔ شاعری میں بادہ و جام اور اس قبیل کے دیگر الفاظ کو جو علامتاً استعمال ہوتے ہیں پروفیسر صاحب نے شدید تنقید کا ہدف بناتے ہوئے فرمایا کہ "یعنی غالب کی شناخت محض کتاب و قلم سے نہیں بلکہ اس فہرست میں ساغر کو اولیت حاصل ہے۔ اس سلسلہ میں قارئین کرام حاشیہ میں ادارتی معروضات بھی ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

پروفیسر صاحب کا کلام "الاقرباء" میں اشاعت پذیر ہوتا رہا ہے اور دیگر معاصرین کا کلام بھی جن میں معروف وممتاز صف اول کے شعرا شامل ہیں چنانچہ ایک مہذب و مدلل ردعمل آیا جو قارئین کرام الاقرباء جولائی تا ستمبر ۲۰۰۲ء کی اشاعت میں محترم محشر زیدی اور ڈاکٹر خیالی امروہی صاحب کے مراسلات کی صورت میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں کہ ہمارا مقصد بھی مراسلات کے صفحات میں ذاتیات و مبالغات کو نہیں بلکہ صحت مند علمی و ادبی مباحث کو نذر قارئین کرنا ہے۔ ادارت کے اس حق کو پروفیسر صاحب تسلیم نہ کریں مگر ادبی صحافت کی یہ ایک متفق علیہ روایت ہے کہ مدیر حشو و زوائد اور غیر ضروری مواد کی تنسیخ و اصلاح کے لئے اپنی صوابدید کو بروئے کار لاسکتا ہے۔ پروفیسر صاحب کو یقین کرنا چاہیے کہ جس طرح ہمیں آج تک ان سے بالمشافہ شرف ملاقات حاصل نہیں اسی طرح محترم محشر زیدی سے بھی ہماری صورت آشنائی تک نہیں صرف "الاقرباء" ہمارے غائبانہ تعارف کا ذریعہ ہے البتہ ڈاکٹر خیالی امروہی سے ہماری دیرینہ یاد اللہ ہے لیکن ہمارا ادبی مسلک شاہد ہے کہ "ہم۔۔۔۔ غالب کے طرفدار نہیں" لہٰذا پروفیسر موصوف کو اپنی یہ غلط فہمی دور کر لینی چاہیے کہ "امروہہ کے پروفیسر صاحب جو غالب کو آگے شراب نوشی اور دلی کو غالب کے بادہ و ساغر کے حوالے سے پہچانتے ہیں اور لاہور کے محشر زیدی جو بزعم خود سرجن ہونے کا دعویٰ کر کے اچھے بھلے صحت مند شعروں کا آپریشن کرتے پھرتے ہیں آپ کے مقرب خاص اور نورتنوں میں سے ہیں"۔

محترم پروفیسر کی ایک غزل ہم شریک اشاعت کر رہے ہیں کہ یہ انکا عطیہ ہے لیکن مستقبل میں ہم کسی ایسی بحث میں ملوث ہونے سے قاصر ہیں جو نہ صرف بے معنی ہو بلکہ آداب شائستگی اور ثقاہت کے بھی منافی ہو۔ (ادارہ)

خبرنامہ

الاقرباء فاؤنڈیشن

(اراکین کیلئے)

مرتبہ
شہلا احمد

احوال وکوائف

☆ ولادت باسعادت

الاقرباء فاؤنڈیشن کے نائب صدر محترم سید ممتاز اللہ سالاری کے فرزند جناب سید مدثر اللہ سالاری کو اللہ تعالیٰ نے ایک پیاری سی بیٹی عطا فرمائی ہے۔ ولادت ۲۵ جون بروز جمعۃ المبارک ۲۰۰۴ء ہوئی۔ نومولودہ کا نام سیدہ ثمر فاطمہ رکھا گیا ہے۔ اس پرمسرت ومبارک موقع پر ادارہ محترم ممتاز اللہ سالاری' عزیزی مدثر اللہ و عزیزہ ولیتی اور دیگر اہل خاندان کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے دختر کی خوش بختی اور درازیٔ عمر کیلئے دعا کرتا ہے۔

☆ سید غضنفر سالاری کی میٹرک میں شاندار کامیابی

سید غضنفر سالاری مشیر قانونی الاقرباء فاؤنڈیشن جناب سید ظفر اللہ سالاری کے ہونہار فرزند ہیں۔ صدیق پبلک اسکول راولپنڈی کے بہترین طلباء میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ گزشتہ سالوں کی طرح اس مرتبہ بھی انہوں نے تعلیمی شعبہ میں بہترین کارکردگی کا ریکارڈ قائم رکھا اور میٹرک سائنس گروپ کا امتحان ماشاء اللہ گریڈ A-1 میں پاس کیا۔ انہوں نے مجموعی طور پر ۷۴۴ (۸۹.۵ فیصد) نمبر حاصل کئے۔ مستقبل میں ان کا ارادہ انجینئرنگ کرنے کا ہے۔ تعلیم کے علاوہ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ تحریری وتقریری مقابلوں اور مباحثوں سے خاصی دلچسپی ہے۔ چنانچہ اکثر وبیشتر مختلف اسکولوں اور تنظیموں کے زیر اہتمام منعقدہ مقابلوں میں شرکت کر کے انعامات جیتتے رہتے ہیں۔

ادارہ میٹرک میں شاندار کامیابی پر انہیں اور تمام اہل خانہ کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہے اور مستقبل میں ہر شعبۂ زندگی میں ایسی شاندار کامیابیوں کیلئے دعا گو ہے۔

☆ حسام وحید نے A-1 حاصل کیا

حسام وحید مجلس منتظمہ الاقرباء فاؤنڈیشن کے رکن محترم سید آفتاب احمد و بیگم آفتاب احمد کے نواسے اور بریگیڈیئر جناب اختر وحید کے صاحبزادے ہیں۔ انہوں نے بھی میٹرک کا امتحان ۶۸۷ مجموعی نمبر حاصل کر کے A-1 گریڈ میں پاس کیا ہے۔ آپ آرمی پبلک اسکول کوہاٹ کے طالب علم تھے اور وہاں کے بہترین طلباء میں شمار کیے جاتے تھے۔

ادارہ انہیں اور ان کے والدین و اہلِ خانہ کو اس شاندار کامیابی پر دلی مبارکباد پیش کرتے ہوئے مستقبل میں بھی ایسی بے شمار کامیابیوں کیلئے دعا کرتا ہے۔

☆ سیدہ سدرہ سالاری کا کلاس نہم میں اعزاز

سیدہ سدرہ سالاری بھی مشیر قانونی الاقرباء فاؤنڈیشن جناب ظفر اللہ سالاری و بیگم نیر سالاری صاحبہ کی دختر نیک اختر ہیں۔ انہوں نے اس سال کلاس نہم (سائنس گروپ) کا امتحان پاس کیا ہے۔ انہوں نے مجموعی طور پر ۳۶۰ (۸۵ فیصد) نمبر حاصل کئے ہیں۔ یہ سرسید گرلز اسکول کی طالبہ ہیں۔ ان کو نعت خوانی سے دلچسپی ہے' اکثر مقابلوں میں حصہ لیتی رہتی ہیں۔

ادارہ کلاس نہم میں شاندار کامیابی پر انہیں' جناب و بیگم ظفر سالاری اور تمام اہلِ خانہ کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آئندہ بھی انہیں ایسی بے شمار کامیابیوں سے سرفراز فرمائے۔ آمین

☆ مریم احمد نے O'level میں فرسٹ پوزیشن حاصل کی

مریم احمد جناب سید نعیم احمد سیکریٹری جنرل الاقرباء فاؤنڈیشن کی ہونہار صاحبزادی ہیں۔ EME High School سے تعلیم کی ابتداء کی۔ وہاں کی ذہین و علم دوست طالبات میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتی ہیں۔ تحریر و تقریر سے دلچسپی ہے۔ اس سال وہ اپنے اسکول کی طرف سے O'level Edencel, London University, Exams, 2004 میں شریک ہوئیں اور بہترین کارکردگی دکھائی۔ انہوں نے آٹھ مضامین امتحان کیلئے منتخب کئے اور تمام میں A's حاصل کئے۔ اور یوں مجموعی طور پر

8A's حاصل کر کے وہ پورے اسکول میں سر فہرست رہیں اور اوّل پوزیشن ہولڈر کا ریکارڈ قائم کیا۔ جو بلاشبہ ایک اعلیٰ ترین اعزاز ہے۔

مستقبل میں وہ انجینئرنگ کے شعبہ سے وابستہ ہونے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ ادارہ ان کو اس شاندار کامیابی پر دلی مبارکباد پیش کرتے ہوئے انہیں ان کے ارادوں میں اعلیٰ ترین کامیابیوں کیلئے دعا کرتا ہے۔۔ سیکرٹری جنرل جناب سید نعیم احمد و بیگم عظمیٰ احمد اور دیگر اہلِ خانہ کو بھی یہ خوبصورت لمحہ بہت بہت مبارک ہو۔۔!

☆ رابعہ جمال کا یونیورسٹی ٹاپ ٹین میں شمار:

رابعہ جمال الاقرباء فاؤنڈیشن کے رکن جمال ناصر خان صاحب کی دختر ہیں۔ بچپن ہی سے نہایت ذہین اور علم کی دلدادہ ہیں۔ پرائمری اور سیکنڈری تعلیم K.B.C.C سیکنڈری ٹیکنیکل سکول بفرزون کراچی سے حاصل کی اور ہمیشہ پورے سکول میں ٹاپ کر کے گولڈ میڈل حاصل کئے۔ میٹرک A-1 گریڈ میں پاس کیا۔۔ آج کل N.E.D یونیورسٹی کراچی میں میکینیکل انجینئرنگ سالِ دوئم کی طالبہ ہیں۔ پہلے سال میں ان کی کارکردگی بہترین رہی۔ ''مکینک'' کے پرچے میں انہوں نے 100% نمبر حاصل کئے اور ''ہمنس پاکستان'' کے اسکالرشپ کیلئے نامزد ہوئیں۔ یونیورسٹی کے ٹاپ ٹین طلباء میں ان کا نام شامل ہے۔۔ تعلیم اور صرف تعلیم ان کی زندگی کا نصب العین ہے۔

ادارہ اتنی ساری کامیابیوں پر عزیزہ رابعہ، جناب جمال ناصر و بیگم حنا جمال صاحبہ کو دلی تہنیت پیش کرتا ہے۔

☆ عائشہ جمال کی میٹرک میں اعلیٰ ترین کارکردگی:

عائشہ جمال بھی جناب جمال ناصر کی صاحبزادی ہیں۔ اپنی بڑی بہن کی طرح یہ بھی انتہائی ذہین اور علم کی شوقین ہیں۔ ہر کلاس میں اعلیٰ کارکردگی پر گولڈ میڈل اور تعریفی اسناد حاصل کرتی رہی ہیں۔ انہوں نے بھی K.B.C.C سیکنڈری سکول سے تعلیم حاصل کی ہے۔ اس سال انہوں نے میٹرک سائنس گروپ کا امتحان A-1 گریڈ میں پاس کیا ہے اور ۸۸.۵ فیصد نمبر حاصل کر کے اپنے ہی اسکول کی طالبہ کا ریکارڈ توڑا ہے۔ تقریروں اور مباحثوں میں بھی حصہ لیتی ہیں۔ کئی انعامات بھی جیتے ہیں۔ آئندہ طب کے شعبہ سے وابستہ ہونے کا عزم رکھتی ہیں۔ نیورو سرجن بن کر دکھی انسانیت کی خدمت کریں گی۔

ادارہ تعلیمی شعبہ میں اعلیٰ کارکردگی پر انہیں اور تمام اہل خانہ کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ

انہیں ان کے نیک ارادوں میں کامیاب وکامران کرے۔آمین۔

☆ ثمرہ جمال نے کلاس ہفتم میں فرسٹ پوزیشن لی:

جمال ناصر صاحب کی ایک اور ہونہار دختر' دوسری بہنوں کی طرح ابتداء سے لے کر اب تک تمام کلاسوں میں اعلیٰ کارکردگی رہی ہے۔ ہمیشہ تعریفی اسناد اور انعامات حاصل کیے۔اس سال انہوں نے کلاس ہفتم اول پوزیشن میں Excellent ریمارکس کے ساتھ پاس کی ہے۔یہ بھی K.B.C.C سکول میں زیر تعلیم ہیں۔کمپیوٹر سے دلچسپی رکھتی ہیں۔آدم جی کمپیوٹرز سے ایک سالہ کورس A-1 گریڈ میں ۹۴ فیصد مارکس لے کر پاس کیا---تمام اہل خانہ اور عزیزہ ثمرہ جمال کو ان کامیابیوں پر ادارے کی طرف سے دلی مبارکباد---اللہ انہیں ایسی بہت سی کامیابیاں عطا فرمائے۔آمین---

☆ مریم جمال کی کلاس چہارم میں شاندار کامیابی:

اور یہ ہیں جناب جمال ناصر کی سب سے چھوٹی صاحبزادی' نہایت ذہین' محنت اور ہمہ وقت پڑھائی میں مشغول رہنے والی--- اسکول کی بہترین طالبہ کا شرف حاصل ہے۔اس سال انہوں نے کلاس چہارم میں اول پوزیشن حاصل کی اور 89.2% نمبر لئے۔انہیں بھی کمپیوٹر سے بڑی دلچسپی ہے لہٰذا اس حوالے سے کچھ نہ کچھ کرتی رہتی ہیں۔حال ہی میں آدم جی کمپیوٹرز سے ایک سالہ کورس A-1 گریڈ میں 98% نمبر حاصل کر کے پاس کیا ہے۔

ادارہ اس شاندار کامیابی پر ننھی مریم اور تمام اہل خانہ کو تہنیت پیش کرتے ہوئے مستقبل میں ان کی کامیابیوں کیلئے دعا کرتا ہے۔

☆ سمیہ حسن کی O'level میں اعلیٰ کارکردگی:

سمیہ حسن الاقرباء فاؤنڈیشن کے رکن جناب حسن سجاد و بیگم عالیہ سجاد صاحبہ کی ہونہار صاحبزادی ہیں۔انہوں نے کیمبرج یونیورسٹی O'level کا امتحان پاس کیا ہے۔اور گرلز ونگ میں فرسٹ پوزیشن لی ہے۔یہ ہیڈ اسٹارٹ سکول کی طالبہ ہیں۔انہوں نے 9 مضامین کا انتخاب کیا تھا۔جن میں سے ایک مضمون پہلے ہی 'A' کے ساتھ پاس

کر چکی ہیں جبکہ بقیہ آٹھ مضامین انہوں نے ایک ساتھ دیئے۔ ان میں انہوں نے 7A's اور ایک 'B' حاصل کیا اور یوں مجموعی طور پر انہوں نے 9 مضامین میں 8A's اور 1B حاصل کئے۔ شعبہ ان کا فائن آرٹس ہے۔ انہوں نے یہ کورس دو سال کی قلیل مدت میں بغیر کسی دوسری مدد کے اتنے شاندار رزلٹ کے ساتھ مکمل کیا۔ جس کے اعتراف میں ان کو A level کرنے کیلئے سکول کی طرف سے اسکالرشپ دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے سکول اور ترکی کی حکومت کی طرف سے انہیں سکول کے دوسرے ۱۵ ٹاپ کلاس طلباء کے ساتھ دوبئی اور ترکی تعلیمی دورہ پر بھیجا جا رہا ہے جہاں یہ پاکستان کی نمائندگی کریں گی۔

سمیہ تعلیم کے ساتھ ساتھ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہیں۔ انہوں نے پھولوں کی سجاوٹ، سلاد تیار کرنے اور اسی طرح کے بہت سے مقابلوں میں شرکت کر کے انعامات جیتے ہیں۔ سکول فنکشنز میں بھی ڈراموں، میوزیکل مقابلوں اور ڈانس وغیرہ میں حصہ لیتی رہی ہیں۔ پارلیمنٹری مباحثوں میں بھی شرکت کرتی رہی ہیں۔ کھیلوں میں ٹیبل ٹینس، بیڈمنٹن اور والی بال پسند ہیں۔ اس کے علاوہ سکول نیوز میگزین کیلئے بھی اعزازی طور پر کام کیا ہے۔ سمیہ سماجی فلاح و بہبود کیلئے بھی بڑے جوش و جذبے سے کام کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے اپنے سکول میں ایک میگزین متعارف کرایا۔ جس کا مقصد مستحق بچوں کو تعلیم سے روشناس کرانا تھا۔ گذشتہ سال انہوں نے EP جینز کے تعاون سے ایک میوزیکل کنسرٹ کا اہتمام کیا جس کی تمام آمدنی پاکستان فاؤنڈیشن فائٹنگ بلائنڈنس (PFFB) کے فنڈ میں دی گئی۔ آج کل بھی وہ چیریٹی شو کرانے کیلئے بڑی محنت کر رہی ہیں تا کہ دکھی انسانیت کی خدمت کر سکیں۔ گذشتہ برس اسلام آباد میں براق کیمپ لگایا گیا تھا جس کیلئے ہزاروں طلباء نے درخواستیں دیں جن میں سے صرف ۱۲ لڑکیاں منتخب ہوئیں اور ان میں ایک سمیہ تھیں۔ علاوہ ازیں سمیہ نے آل پاکستان عبدالقدیر خان بارہویں سوفٹ ویئر نمائش میں بھی شرکت کی اور ایک ویب سائٹ تیار کر کے اول انعام جیتا۔

سمیہ کو اللہ تعالیٰ نے بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ کچھ کر گزرنے کے جذبے اور محنت نے ان کی صلاحیتوں کو جلا بخشی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تعلیم سے لے کر ہر شعبہ زندگی میں کامیاب ہیں۔ اپنی ان کامیابیوں پر وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتی ہیں کہ جس نے انہیں اس قابل بنایا۔ اس کے بعد وہ اپنے والدین کی بے انتہا شکر گزار ہیں کہ جن کی رہنمائی اور ہر ہر قدم پر تعاون نے انہیں کامیابیوں سے ہمکنار کیا۔۔۔

ادارہ سمیہ حسن کے جذبات و احساسات کو جو وہ دکھی انسانیت کیلئے اپنے دل میں رکھتی ہیں۔ قدر کی نگاہ سے

دیکھتا ہے۔ اور دعا کرتا ہے کہ اللہ رب العزت انہیں ان نیک مقاصد میں کامیاب و کامران کرے۔ آمین۔

☆ سعادت عمرہ:

گزشتہ دنوں سیکرٹری جنرل الاقرباء فاؤنڈیشن جناب سید نعیم احمد اپنے اہل و عیال اور والدہ محترمہ کے ہمراہ بیت اللہ شریف تشریف لے گئے تھے۔ وہاں سب عمرہ کی سعادت سے مشرف ہوئے۔ اللہ تعالی شرف قبولیت بخشے۔ آمین۔ تمام اراکین فاؤنڈیشن اور ادارہ سہ ماہی الاقرباء انہیں اور تمام شرکائے سفر سعید کو اس مبارک موقع پر دلی تہنیت پیش کرتے ہیں۔

☆ شادی خانہ آبادی:

رکن الاقرباء فاؤنڈیشن جناب سید منسوب علی زیدی و بیگم فیروزہ زیدہ صاحبہ کی صاحبزادی ڈاکٹر حمزہ زیدی اور حافظ سید محمد منصور شکیل مورخہ ۲۵ جولائی ۲۰۰۴ء بروز جمعتہ المبارک الحمد للہ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔۔۔ شادی کی خوبصورت و پُر وقار تقریب کا اہتمام مارگلہ موٹل میں کیا گیا تھا۔ اراکین الاقرباء فاؤنڈیشن، عزیز و اقارب اور احباب کی بڑی تعداد نے اس مبارک موقع پر شرکت کی۔ جن کی تواضع اور خاطر و مدارات پُر تکلف عشائیہ سے کی گئی۔۔

ادارہ سہ ماہی الاقرباء اس مبارک و پُر مسرت جیون بندھن پر محترم سید محبوب علی زیدی، جناب منسوب علی زیدی و بیگم فیروزہ زیدی صاحبہ، دیگر اہل خانہ اور دولہا دولہن کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔ اللہ تعالی زندگی کے اس حسین سفر میں عزیزہ حمزہ اور عزیزی منصور شکیل کو سدا خوش و خرم رکھے۔ آمین ثم آمین۔

☆ بیگم طیبہ آفتاب صاحبہ کو صدمہ:

محترمہ بیگم طیبہ آفتاب رکن مجلسِ انتظامیہ الاقرباء فاؤنڈیشن کے برادر جناب راشد انصاری گزشتہ دنوں امریکہ میں انتقال فرما گئے۔ آپ کافی عرصہ سے علیل تھے۔ گزشتہ سال ہیوسٹن کے ہسپتال میں ان کا بسلسلۂ عارضہ قلب بائی پاس اور ایک میجر آپریشن ٹیومر کی وجہ سے ہوا تھا۔ لیکن آپ صحت یاب نہ ہو سکے۔۔۔ اراکین فاؤنڈیشن اور ادارہ سہ ماہی الاقرباء اس سانحہ رحلت پر دکھ کا اظہار کرتے ہیں اور بیگم صاحبہ دیگر لواحقین و اہل خانہ کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ اللہ تعالی مرحوم کو غریق رحمت کرے اور جنت الفردوس میں بلند درجہ عطا فرمائے۔ اور پسماندگان و جملہ اہل خاندان و بیگم صاحبہ کو یہ صدمۂ عظیم برداشت کرنے کا ہمت

وحوصلہ عطا فرمائے۔ آمین

☆ انتقالِ پُرملال:

جناب سید نذر علی زیدی رکن مجلس انتظامیہ الاقرباء فاؤنڈیشن کے سمدھی اوران کی بہو عزیزہ عظمیٰ فرحان کے والد محترم خورشید احمد گزشتہ ماہ انتقال فرما گئے۔ آپ کچھ دنوں سے شدید علیل تھے۔ انجائنا کا اٹیک' انجیو گرافی اور پھر بائی پاس--- آپ کیلئے جان لیوا ثابت ہوئے۔ غم واندوہ کے اس موقع پر ادارہ آپ کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہے کہ وہ مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے اوران کی مغفرت فرمائے۔ ان کے اہلِ خانہ عزیز و اقارب اور جملہ متعلقین وعزیزہ عظمیٰ کو یہ عظیم صدمہ برداشت کرنے کا حوصلہ عطا فرمائے۔ آمین---

☆ سانحہ رحلت سید آفتاب احمد:

انتہائی دکھ اور افسوس کے ساتھ یہ خبر رقم کی جاتی ہے کہ محترم سید آفتاب احمد رکن مجلس انتظامیہ الاقرباء فاؤنڈیشن مورخہ ۸ ستمبر ۲۰۰۴ء بدھ اور جمعرات کی درمیانی شب تقریباً ساڑھے گیارہ بجے اس دنیائے فانی سے رخصت فرما گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون--- آپ تقریباً ایک ہفتے سے السر کی شدید تکلیف کے باعث ملٹری ہسپتال راولپنڈی میں داخل تھے۔ آپ الاقرباء فاؤنڈیشن کے روحِ رواں تھے اور فاؤنڈیشن کے بانی ارکان میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔

آپ کی خوش طبعی' خوش اخلاقی اور خلوص نے احباب' عزیز واقارب اوراپنے اور بیگانے سب کو ان کا گرویدہ بنادیا تھا۔ وہ بزرگوں میں بزرگ' بڑوں میں بڑے' جوانوں میں جوان اور بچوں میں بچہ بن جایا کرتے تھے۔ بچوں سے توان کو عشق کی حد تک پیار تھا۔ جبھی اپنی ہو یا پرائی' اس پر جان چھڑکتے تھے۔ ہر ایک سے اتنی محبت اور اپنائیت سے گفتگو کرتے تھے کہ اس کو یہی گمان ہوتا کہ وہ اس کو دنیا میں سب سے زیادہ چاہتے ہیں۔ آپ کا شفقت بھرا لہجہ' دھیما اور ٹھہرا ٹھہرا انداز گفتگو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جاسکے گا۔ الاقرباء کی کوئی تقریب' کوئی میٹنگ اور کوئی پروگرام ہو ان کے بغیر بے رونق اور پھیکا پھیکا لگتا تھا۔ نوجوان

نسل کی صحت مند سرگرمیوں اور تعلیمی شعبے میں بہترین کارکردگی کی حوصلہ افزائی کیلئے آپ اپنی اہلیہ محترمہ طیبہ آفتاب کے ساتھ مل کر ہر سال انعامات اور شیلڈز کا اہتمام کرتے تھے۔ جو آپ کی علم پروری اور علم دوستی کا بین ثبوت ہیں۔ غرض یہ کہ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے جس کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

جناب سید آفتاب احمد ۱۸ جنوری ۱۹۳۶ء کو یوپی (بھارت) میں ضلع بلند شہر کے ایک قصبہ گلاؤٹھی میں پیدا ہوئے۔ سادات کا یہ علمی و دینی اقدار کا حامل خاندان ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی وجہ سے ایک شہرت رکھتا تھا۔ جناب آفتاب احمد نے مسلم ہائی سکول بلند شہر سے میٹرک اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ۱۹۶۰ء میں ایم ایس سی کیا۔ ازاں بعد پاکستان ہجرت کی اور واپڈا سے ملازمت کا آغاز کیا۔ یہاں سے حکومت نے ۱۹۷۷ء میں آپ کو ڈیپوٹیشن پر لیبیا بھیج دیا۔ جہاں آپ کا قیام ۱۹۸۴ء تک رہا۔ اور وہیں سے آپ امریکہ، یورپ اور بیشتر مسلم ممالک کے دوروں پر گئے۔ لیبیا سے واپسی پر آپ کا تقرر اسلام آباد سی ڈی اے میں بطور Geo-hydrologist ہو گیا۔ یہیں سے آپ ۱۷ جولائی ۱۹۹۶ء کو ریٹائر ہوئے۔

محترم آفتاب احمد کے پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ دو فرزند اور ایک دختر شامل ہیں۔ یہ سب بچے شادی شدہ اور صاحب اولاد ہیں۔ بڑے بیٹے عمران سید انجینئر ہیں اور امریکہ میں مقیم ہیں۔ چھوٹے صاحبزادے ریحان سید بینکر ہیں اور دوبئی میں ملازمت کے سلسلے میں رہائش پذیر ہیں۔ جبکہ بیٹی نائلہ سید سیالکوٹ میں اپنے شوہر بریگیڈئر اختر وحید اور بچوں کے ساتھ رہتی ہیں۔

ادارہ سہ ماہی الاقرباء اور تمام اراکین فاؤنڈیشن جناب آفتاب احمد کی اہلیہ محترمہ بیگم طیبہ اور بچوں اور دیگر اہل خانہ و متعلقین کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ اللہ مرحوم سید آفتاب احمد صاحب کے درجات بلند کرے اور جوار رحمت میں جگہ دے اور جملہ لواحقین کو یہ صدمۂ عظیم برداشت کرنے کی طاقت و حوصلہ عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

"آسمان تیری لحد پر شبنم افشانی کرے"

رپورٹ

شہلا حسن زیدی

الاقرباء فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام محفلِ میلاد کا انعقاد

الاقرباء فاؤنڈیشن کی مجلسِ عاملہ کا ماہانہ اجلاس مورخہ ۱۰ جولائی ۲۰۰۳ء جناب ایس ایم حسن زیدی کی رہائش گاہ پر شام ۶ بجے منعقد ہوا۔ بعد از مغرب ایک روح پرور اور ایمان افروز محفلِ میلاد کا انعقاد ہوا۔ جس میں الاقرباء فاؤنڈیشن کے اراکین بمعہ اہل خانہ شریک ہوئے۔ ان کے علاوہ دیگر مہمانانِ خصوصی بھی اس محفلِ بابرکت میں شرکت کیلئے تشریف لائے۔ اس طرح تقریباً ۵۰ خواتین و حضرات نے اس محفل کو رونق بخشی۔

محفلِ میلاد کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ تلاوت بیگم نسرین جاوید صاحبہ نے کی۔ جن خواتین و حضرات نے حضور اکرم احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ ﷺ کے حضور نذرانہ نعت پیش کیا۔ ان میں میزبانِ محفل سید محمد حسن زیدی۔ آل پاکستان مقابلہ نعت خوانی میں اول انعام یافتہ آنسہ ارم گیلانی، نوشابہ واحد اور دیگر خواتین شامل تھیں۔ اسی متبرک اور بابرکت محفل سے اسلام آباد کے ممتاز عالمِ دین علامہ ضمیر احمد ساجد دامت برکاتہٗ نے حضور اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ پر خصوصی خطاب فرمایا۔ تقریب کا اختتام صلاۃ و سلام کے حسین لمحات کے ساتھ ہوا۔

بیگم نسرین جاوید صاحبہ نے انتہائی عاجزی انکسار، دل کی بے پناہ گہرائیوں اور پرنم جذبات کے ساتھ اللہ تبارک و تعالیٰ کے حضور تمام حاضرین اور ملک و قوم کیلئے دعا کرائی۔ محفلِ میلاد کی کامیابی کی دلیل یہ ہے کہ تمام حاضرین آخیر وقت تک ہمہ تن گوش رہے اور اس محفل کی برکات محسوس کرتے رہے۔

محفلِ میلاد کے اختتام پر الاقرباء فاؤنڈیشن کے صدر جناب سید منصور عاقل نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اس قسم کی محفلیں ہمارے جذبۂ ایمانی کو بیدار کرتی ہیں اور ہم سب کیلئے روحانی سکون اور عاقبت سنوارنے کا موقعہ فراہم کرتی ہیں۔ اس موقعہ پر صدر فاؤنڈیشن نے جناب محمد حسن زیدی رکن مجلس عاملہ کا خصوصی شکریہ ادا کیا جنہوں نے نہ صرف یہ محفل اپنی رہائش گاہ پر منعقد کی بلکہ تمام حاضرین مجلس کیلئے ایک پُرتکلف عشائیہ کا بھی بندوبست کیا۔

تسنیم کوثر

بغداد جل رہا ہے

بغداد لُٹ رہا ہے ' بغداد جل رہا ہے
انسانیت کا سینہ غم سے پگھل رہا ہے

ہر سو بچھے ہیں لاشے ہر جا ہے خوں کی بارش
کربل میں پھر لہو کا دریا ابل رہا ہے

اہل نجف پہ کیسے غم کے پہاڑ ٹوٹے
دل کرب بیکراں سے پہلو بدل رہا ہے

تکریت ہو کہ کرکوک ہر سمت آگ پھیلی
ہر گھر سے ہی دھوئیں کا بادل نکل رہا ہے

بچوں سے مائیں بچھڑیں کتنے سہاگ اجڑے
بارود روز کتنی انساں نگل رہا ہے

اس دیس میں کہاں اب امن واماں کی ٹھنڈک
انگاروں پہ یہاں کا ہر شخص جل رہا ہے

مغرب کا ایک آقا طاقت پہ ہو کے نازاں
کیسے درندگی کے سانچے میں ڈھل رہا ہے

اس پاک سرزمیں کی پامال کی ہے حرمت
جس سے نجابتوں کا سورج نکل رہا ہے

ناموس اہل ایماں اللہ کے حوالے
اس آس کے سہارے ہی دل سنبھل رہا ہے

سید انتظام الدین حیرت

نعت☆

اے ختم رُسل، مالکِ کُل، جانِ مدینہ
اے شاہِ اُمم، شاہِ کرم ، شانِ مدینہ

خاکِ درِ طیبہ کی قسم سرورِ عالم
سب آپ پہ قربان ہے سلطانِ مدینہ

عاصی کی بھی اک عرض ہے اے قبلۂ حاجات
ہو پورا بصد شوق یہ ارمانِ مدینہ

ہے فخر کہ ہوں آپ کی امت میں شہِ دیں
گو بندۂ ناچیز ہوں سلطانِ مدینہ

اب چشمِ تمنا مری اے شافعِ محشر
ہے طالبِ دیدارِ گلستانِ مدینہ

کاٹے نہیں کٹتی ہیں مرے شوق کی گھڑیاں
اب مجھ کو بلا لیجئے سلطانِ مدینہ

حیرت کی تمنا ہے کہ لبیک کہے وہ
پائے جو اشارہ شہِ ذی شانِ مدینہ

☆ اپنے والد مرحوم کی یہ غیر مطبوعہ نعت جناب سید انیس الدین احمد رکن الاقرباء فاؤنڈیشن نے عطیہ کی۔

بیگم طیبہ آفتاب

"گھریلو چٹکلے"

☆ پلکوں کی خوبصورتی کیلئے:

اصلی شہد اور کسٹر آئل برابر مقدار میں لے کر اچھی طرح مکس کر لیں اور صاف ستھری شیشی میں محفوظ کر لیں اور روزانہ رات کو سوتے وقت اس مرکب کو پلکوں پر لگائیں کچھ ہی دنوں میں پلکیں لمبی اور پرکشش ہو جائیں گی۔

☆ چیونٹیوں سے نجات کیلئے:

چیونٹیوں کے گھر میں مٹی کا تیل ڈال کر اوپر سے چونا اچھی طرح چھڑک دیں۔ چیونٹیاں وہیں رک جائیں گی اور کمروں کا رخ نہیں کریں گی۔

☆ کپڑوں میں لگے بٹن مضبوط کرنے کا طریقہ:

اکثر دیکھا گیا ہے کہ کپڑوں میں لگے بٹن بہت جلد ٹوٹ جاتے ہیں اور ان کو دوبارہ ٹانکنا پڑتا ہے۔ اس زحمت سے بچنے کا ایک موثر طریقہ یہ ہے کہ کپڑے اور بٹن کے درمیان والی جگہ پر بے رنگ نیل پالش لگا دیں۔ اس سے دھاگے کے ریشے مضبوط ہو جائیں گے اور بٹن جلد نہیں ٹوٹیں گے۔

☆ کنگھا صاف کرنے کا طریقہ:

کنگھا گندہ ہو جائے تو اسے گرم پانی میں سوڈا ملا کر اچھی طرح دھو لیں۔ بالکل نیا ہو جائے گا۔

☆ استری صاف کرنے کا طریقہ:

اکثر استری کی نچلی سطح پر جلنے کے داغ پڑ جاتے ہیں۔ ان داغوں کو صاف کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ استری کو ہلکا سا گرم کر کے آہستہ آہستہ بلیڈ سے رگڑ کر کپڑے سے صاف کر لیں --- سطح چمک جائے گی۔

☆ مکھیوں سے نجات کیلئے:

جس جگہ مکھیوں کی یلغار ہو وہاں تھوڑا سا پودینہ رکھ دیجئے۔ مکھیاں غائب ہو جائیں گی۔

☆نمک دانی میں نمک جم جائے تو:

برسات اور سردی کے موسم میں اکثر نمک دانی میں نمک جم جاتا ہے۔اس سے بچنے کیلئے نمک دانی میں چند دانے کچے چاول کے ڈال دینے سے نمک نہیں جمے گا۔

☆چہرے کیلئے بہترین ٹانک:

دو ٹماٹر بلینڈر میں ڈال کر اچھی طرح بلینڈ کرلیں اور پھر اسے ململ کے کپڑے میں ڈال کر نتھار لیں۔ اس میں آدھا کپ لیموں کا رس ایک چمچہ گلیسرین اور دو چمچ گلاب کا عرق ملالیں۔تیار شدہ یہ لوشن چہرے کی رنگت نکھارتا ہے۔چہرے پر چمک اور شگفتگی پیدا کرتا ہے۔اور ہیڈز بننے سے روکتا ہے۔

☆کیل مہاسے اور ان کا علاج:

ایک گلاس دودھ میں تھوڑی سی گندھک بھگودیں۔رات کو سوتے وقت اس کو چہرے پر مل لیں اور صبح اٹھ کر تازہ دودھ میں پانی ملا کر چہرہ دھولیں۔چند روز تک یہ عمل دہرائیں۔چہرہ کیل مہاسوں سے پاک ہو جائے گا۔

☆خشک جلد والی خواتین کیلئے:

خشک جلد کیلئے لیموں اور شہد کا مکسچر اکسیر کی حیثیت رکھتا ہے۔خشک جلد رکھنے والی خواتین کو چاہیے کہ ہر تین چار دن بعد لیموں اور شہد کو ملا کر چہرے پر اچھی طرح لگائیں اور پندرہ منٹ بعد سادہ پانی سے چہرہ دھولیں۔رنگت نکھرنے کے ساتھ ساتھ چہرہ شگفتہ اور دلکش ہو جائے گا۔

☆وزن کم کرنے کیلئے:

مچھلی اور مرغی کا استعمال وزن کم کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔صبح نہار منہ ایک گلاس پانی میں لیموں کا رس اور نمک ملا کر پینے سے بھی وزن کم ہوتا ہے۔جبکہ صبح شام کی واک سونے پر سہاگے کا کام کرتی ہے۔

☆ٹھنڈ لگ جانے کی صورت میں:

اگر ٹھنڈ سے سینہ جکڑ جائے اور سانس لینے میں تکلیف محسوس ہو اور سینے سے کھڑ کھڑ کی آواز آئے تو ایسی صورت میں اجوائن کا استعمال تریاق کا کام کرتا ہے۔اجوائن توے پر بھون کر کسی لوہے کی چیز سے ہلکا ہلکا کوٹ کر دردرہ سے کرلیں اور اس میں تھوڑی سی چینی ملالیں۔دن میں دو تین مرتبہ چٹکی چٹکی استعمال کریں۔

انشاءاللہ فوری افاقہ ہوگا۔

کھانسی، نزلہ، زکام۔ کسی موسم یا کسی وقت کے پابند نہیں

ہمدرد کی مجرب دوائیں ان کا علاج بھی ہیں اور ان سے محفوظ رہنے کی مؤثر تدبیر بھی

سُعالین

مُفید جڑی بوٹیوں سے تیار کردہ سُعالین، گلے کی خراش اور کھانسی کا آسان اور مؤثر علاج۔ آپ گھر میں ہوں یا گھر سے باہر، سرد و خشک موسم یا گرد و غبار کے سبب گلے میں خراش محسوس ہو تو فوراً سُعالین لیجیے۔ سُعالین کا باقاعدہ استعمال گلے کی خراش اور کھانسی سے محفوظ رکھتا ہے۔

جوشینا

نزلہ، زکام، فلو اور اُن کی وجہ سے ہونے والے بخار کا آزمودہ علاج۔
جوشینا کا روزانہ استعمال موسم کی تبدیلی اور فضائی آلودگی کے مضر اثرات بھی دُور کرتا ہے۔
جوشینا بند ناک کو فوراً کھول دیتی ہے۔

لعوق سپستاں

نزلے زکام میں سینے پر بلغم جم جانے سے شدید کھانسی کی تکلیف طبیعت نڈھال کر دیتی ہے۔
اس صورت میں صدیوں سے آزمودہ ہمدرد کا لعوق سپستاں، خشک بلغم کے اخراج اور شدید کھانسی سے نجات کا مؤثر ذریعہ ہے۔
ہر موسم میں، ہر عمر کے لیے

صَدوری

مؤثر جڑی بوٹیوں سے تیار کردہ خوش ذائقہ شربت۔ خشک اور بلغمی کھانسی کا بہترین علاج۔ صَدوری سانس کی نالیوں سے بلغم خارج کر کے سینے کی جکڑن سے نجات دلاتی ہے اور پھیپھڑوں کی کارکردگی کو بہتر بناتی ہے۔ بچوں، بڑوں سب کے لیے یکساں مُفید۔

سُعالین، جوشینا، لعوق سپستاں، صَدوری۔ ہر گھر کے لیے بے حد ضروری

www.hamdard.com.pk

Adara-SJLS-1/2001

Quarterly **AL-AQREBA** ISSN 1812-8734 Islamabad

ISLAMABAD REGISTERED No. 252

A literary, academic, educational & socio-cultural magazine of Al-Aqreba Foundation, Islamabad.

House # 464, Street 58. I-8/3, Islamabad.